آہنگ

مجاز

ناشر

آزاد کتاب گھر

کلاں محل، دہلی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

مارچ سنہ ۱۹۵۲ء

اضافہ شدہ قیمت
چھ روپیہ آٹھ آنے

آزاد کتاب گھر
کلاں محل دہلی

قیمت چار روپے (للعہ)

(نعمانی پریس دہلی)

فیض اور جذبی کے نام
جو
میرے دِل و جگر ہیں
سردار اور مخدوم کے نام
جو
میرے دست و بازُو ہیں

نشانات

دیباچہ

(فیض احمد فیضؔ)

آہنگ کا پہلا اڈیشن اس شعر سے شروع ہوتا تھا ؎

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

مجاز کی شاعری انہیں تینوں اجزا سے مرکب ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ان کا کلام زیادہ مقبول بھی ہے۔ ہمارے بیشتر شعرائے ان عناصر میں ایک فرضی تضاد کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں، کوئی محض ساز و جام کا دلدادہ ہے تو کوئی فقط شمشیر کا دھنی، لیکن کامیاب شعر کے لئے (آج کل کے زمانے میں) شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز دونوں ضروری ہیں۔ ع دلبری با قاہری جادوگری است

مجاز کے شعر میں یہ امتزاج موجود ہے۔

اس امتزاج میں ابھی تک شمشیر کم ہے اور ساز و جام زیادہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ شمشیر زنی کے لئے ایک خاص قسم کے دماغی زہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مجاز کی طبیعت

ہیں زہد کم ہے۔ لذتیت زیادہ۔ شمشیر زنی کو میں انقلابی شاعری کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں، دماغی زُہد سے میری مُراد ہے ایک مخصوص انقلابی مقصد کے نشر و اظہار میں کلّی ذہنی اور جذباتی یکسوئی، تمام غیر متعلق جذباتی ترغیبات سے پرہیز، یہ کٹھن اور محنت طلب عمل ہے، مجاز ہم سب کی طرح لااُبالی اور سہل نگار انسان ہیں، چنانچہ جب بھی انہیں ذوقِ نہاں کو کامرانی کا موقعہ ملے باز نہیں رہ سکتے۔

مجاز کے شعر کا ارتقا بھی ہمارے بیشتر سے مختلف ہے، عام طور سے ہمارے ہاں شعر یا شاعر کا ارتقائی عمل یہ صورت اختیار کرتا ہے، ساز و جام، ——— ساز و جام، شمشیر شمشیر، مجاز کے شعر میں اس عمل کی صورت یہ ہے۔ ساز و جام ——— شمشیر ——— ساز و جام، شمشیر، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رجعت نہیں ترقی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر کے مضمون اور تجربہ میں مطابقت اور موانست زیادہ گہری ہوتی جا رہی ہے۔ شاعر کی طبیعت خارجی اور انقلابی مضامین کے اینٹ پتھر کو تراشنے اور جوڑنے جمانے میں زیادہ لذت محسوس کرنے لگی ہے۔

مجاز بنیادی طور پر اور طبعاً غنائی شاعر ہے، اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی کڑک نہیں، باغی کے دل کی آگ نہیں، نغمہ سنج کے گلے کا وفور ہے۔ یہی وفور مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اس شعر کی کامیابی کا سب سے بڑا امین، بیچ کے ایک مختصر سے دور کے علاوہ مجاز ہمیشہ سے گاتا رہا ہے۔ اس کے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی، لیکن اس کے آہنگ میں فرق نہ آیا۔ کبھی اس نے آغازِ بلوغت کی بھرپور مفکرانہ خواب ساحجت کے گیت گائے ؎

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

نُور ہی نُور ہے کس سمت اٹھاؤں آنکھیں
حُسن ہی حُسن ہے تا حدِ نظر آج کی رات

اللہ اللہ وہ پیشانیٔ سیمیں کا جمال
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات

وہ تبسم ہی تبسم کا جمالِ پیہم
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

کبھی اس خواب کی شکست پر آنسو بہائے ؎

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوقِ نظارہ کیا کہیئے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجیے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے

کبھی اس خالص تخریبی اور مجبور پیچ و تاب کا اظہار کیا جو موجودہ حال کے متعلق ہر نوجوان کا اضطراری اور پہلا جذباتی ردِّ عمل ہوتا ہے۔

جی میں آتا ہے یہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

کبھی اس تعمیری انقلاب کے اسباب و آثار کا تجزیہ کیا جس کے نقوش صرف غور و فکر کے

بعد دکھائی دینے لگتے ہیں ؎

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

یہ کافی متنوع مرکب ہے لیکن اس میں کہیں بھی مجاز کا ترنم بے آہنگ، اس کی دُھن پھیکی، یا اس کے سُر بے سُر نہیں ہوئے۔ مجاز کے کلام میں پرانے شعراء کی سہولتِ اظہار ہے، لیکن ان کی جذباتی سطحیت اور محدود خیالی نہیں، نئے شعراء کی نزاکتِ احساس ہے، ان کی لفظی کھینچا تانی اور توڑ مروڑ نہیں۔ اس کے ترنم میں چاندی کا سا فیاضانہ حسن ہے جس کے پرتو سے تاریک اور روشن چیزیں یکساں دل کش نظر آتی ہیں۔ غنائیت ایک کیمیاوی عمل ہے، جس سے معمولی روزمرہ الفاظ عجیب پُراسرار، پُرمعنی صورت اختیار کر لیتے ہیں، بعینہٖ جیسے عنفوانِ شباب میں سادہ پانی مئے رنگیں دکھائی دیتا ہے یا مئے رنگیں کے اثر سے بے رنگ چہرے عنابی ہو جاتے ہیں۔ مجاز کو اس کیمیاوی عمل پر قدرت ہے ؎

ہمدم یہی ہے رہگزرِ یارِ خوش خرام
گزرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

ضو فگن روئے حسیں پر شبِ مہتابِ شباب
چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لئے

نشۂ نازِ جوانی میں سشراور ادا
جسم ذوقِ گہر و اطلس و کمخواب لئے

سکونِ دیر، تقدیسِ کلیسا
گدازِ امتِ خیر البشر بھی

یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہگزر بھی

یہی غنائیت مجاز کو اپنے دور کے دوسرے انقلابی اور غنائی شاعروں سے ممیز کرتی ہے۔ مجاز کی غنائیت عام غنائی شعراء سے مختلف ہے، عام غنائی شعراء محض عنفوانِ شباب کے دو چار محدود ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان تجربات کی تحریک ان کی شدت اور قوتِ نمو ختم ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ عام غنائی شعراء کی شاعرانہ عمر بہت کم ہے۔ ان کا اوسط سرمایہ پانچ دس کامیاب عشقیہ نظمیں ہیں۔ بعد میں وہ عمر بھر انہیں پانچ دس نظموں کو دہراتے رہتے ہیں۔ یا خاموش ہو جاتے ہیں۔ مجاز کی غنائیت زیادہ وسیع، زیادہ گہرے، زیادہ مستقل مسائل سے متصل ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں ابھی تک ارتقاء کی گنجائش اور پنپنے کا امکان ہے، اس کے شباب میں بڑھاپے کا رنگ نہیں جھلکتا۔ عام نوجوان شعراء کی غنائیت زندگی سے بیزار اور موت سے وابستہ ہے۔ انہیں زندگی کی لذتوں کی آرزو نہیں، موت کے سکون کی ہوس ہے، مجاز گرم زندگی کے نشے سے چور اور موت کے سرد جمود سے سراسر بیزار ہے ؎

مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

یہی وجہ ہے کہ مجاز کے شعر میں تھکن نہیں مستی ہے، اداسی نہیں سرخوشی ہے، مجاز کی انقلابیت، عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں۔ للکارتے ہیں۔ سینہ کوٹتے ہیں، انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے، ان کے ذہن میں آمدِ انقلاب کا تصور طوفانِ برق و رعد سے مرکب ہے۔ نغمہ ہزار اور رنگینیٔ بہار سے عبارت نہیں۔ وہ صرف انقلاب کی ہولناکی کو دیکھتے ہیں۔ اس کے حسن کو نہیں پہچانتے، یہ انقلاب کا ترقی پسند نہیں رجعت پسند تصور ہے یہ برق و رعد کا دور مجاز پر بھی گذر چکا ہے

لیکن اب مجاز کی غنائیت اسے اپنا چکی ہے ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

تقدیر کچھ ہو، کاوشِ تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظرِ عشرتِ فردا ادھر بھی آ

برق و رعد والوں میں یہ خلوص اور تیقن تو ہے۔ یہ لوچ اور نغمہ نہیں ہے۔ ان میں انقلاب کی قاہری ہے دلبری نہیں ہے میں سمجھتا ہوں کہ مجازؔ کی "خواب سحر" اور نوجوان خاتون سے خطاب، اس دور کی سب سے مکمل اور سب سے کامیاب ترقی پسند نظموں میں سے ہیں مجازؔ انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں، انقلاب کا مطرب ہے، اس کے نغمہ میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی ہے اور بہار کی رات کی سی گرم جوش تاثر آفرینی!

فیض احمد فیضؔ

غزل

حُسن کو بے حجاب ہونا تھا
شوق کو کامیاب ہونا تھا

ہجر میں کیفِ اضطراب نہ پوچھ
خونِ دل بھی شراب ہونا تھا

تیرے جلووں میں گھر گیا آخر
ذرّے کو آفتاب ہونا تھا

کچھ تمہاری نگاہ کافر تھی
کچھ مجھے بھی خراب ہونا تھا

رات تاروں کا ٹوٹنا بھی مجازؔ
باعثِ اضطراب ہونا تھا

سنہ ۱۹۳۰ء

غزل

یونہی بیٹھے رہو بس دردِ دل سے بے خبر ہو کر
بنو کیوں چارہ گر تم کیا کرو گے چارہ گر ہو کر

دکھا دے ایک دن اے حسنِ رنگیں جلوہ گر ہو کر
وہ نظارہ جو ان آنکھوں میں رہ جائے نظر ہو کر

دلِ سوز آشنا کے جلوے تھے جو منتشر ہو کر
فضائے دہر میں چمکا کئے برق و شرر ہو کر

وہی جلوے جو اک دن دامنِ دل سے گریزاں تھے
نظر میں رہ گئے گلہائے دامانِ نظر ہو کر

فلک کی سمت کس حسرت سے تکتے ہیں معاذاللہ
یہ نالے نارسا ہو کر، یہ آہیں بے اثر ہو کر

یہ کس کے حسن کے رنگین جلوے چھائے جاتے ہیں
شفق کی سرخیاں بن کر، تجلّیِ سحر ہو کر

۱۹۳۱ء

نمائش میں

وہ کچھ دوشیزگانِ ناز پرور — کھڑی ہیں اک بساطی کی دکاں پر
نظر کے سامنے ہے ایک محشر — اور اک محشر ہے میرے دل کے اندر
سنہرا کام رنگین ساریوں پر — بساطِ آسماں پر ماہ و اختر
جمال و حُسن کے پُر رعب تیور — نمایاں چاندسی پیشانیوں پر
وہ رُخساروں پہ ہلکی ہلکی سُرخی — لبوں میں پرفشاں روحِ گلِ تر
سیہ زُلفوں میں رُوحِ سنبلستاں — نظر سرچشمۂ تسنیم و کوثر
ادائے ناز غرقِ کیفِ صہبا — سیہ مژگاں شراب آلودہ نشتر
چمک تاروں کی چشمِ سرگیں میں — جھلک چاندی کی جسمِ مرمریں پر
وہ خوشبو آرہی ہی پیرہن سے — فضا ہی دور تک جس سے معطّر

تبسم اور ہنسی کے نرم طوفاں — فضاؤں میں مسلسل بارشِ زر
نشاطِ رنگ و بُو سے چُور آنکھیں — شراب ناب سے لبریز ساغر
وہ محرابیں سی سینوں پر نمایاں — فضائے نور میں کیوپڈ کے شہپر
نفس کی آمد و شد سے تلاطم — شبِ مہتاب میں جیسے سمندر
ستاروں کی نگاہیں جھک گئی ہیں — زمیں پھر خندہ زن ہے آسماں پر
کوئی آئینہ دارِ حُسنِ فارس — کسی میں حُسنِ یونانی کے جوہر
کسی میں عکسِ "معصُوم کلیسا" — کسی میں پرتوِ اصنامِ آذر
یہ شیریں ہے وہ نوشابہ ہی شاید — نہیں یاں فرقِ فرہاد و سکندر
یہ اپنے حُسن میں عذرائے وامق — وہ اپنے ناز میں سلمائے اختر
یہ تابانی میں خورشیدِ درخشاں — وہ رعنائی میں اس سے بھی فزوں تر
ہنسی اِس کی طلوعِ صبحِ خنداں — نوا اس کی سرودِ کیف آور
یہ شعلہ آفریں وہ برق افگن — یہ آئینہ جبیں وہ ماہ پیکر

وہ جنبش سی ہوئی کچھ آنچلوں کو — وہ لہریں سی اٹھیں کچھ ساریوں پر
خرامِ ناز سے نغمے جگاتی ! — وہ چل دیں ایک جانب مسکرا کر
کسی کی حسرتیں پامال کرتی — کسی کی حسرتیں ہمراہ لے کر

کبھی آنکھیں دکانوں پر جمی ہیں　　کبھی خود اپنی ہی برنائیوں پر
اِدھر ہم نے اِک آہِ سرد کھینچی
ہنسی پھر آگئی اپنے کئے پر

۱۹۳۱ء

غزل

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں
یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں
تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں
یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذاللہ
تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں
اس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے
جہاں سے چاہتا ہوں تم کو دیکھتا ہوں میں

بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

کبھی یہ زعم کہ تو مجھ سے چھپ نہیں سکتا
کبھی یہ وہم کہ خود بھی چھپا ہوا ہوں میں

مجھے سُنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت
مجازؔ ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

۱۹۳۱ء

غزل

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

تو جہاں ہے زمزمہ پرداز ہے
دل جہاں ہے گوش بر آواز ہے

ہاں ذرا جرأت دکھا اے جذبِ دل
حسن کو پردے پہ اپنے ناز ہے

ہم نشیں دل کی حقیقت کیا کہوں
سوز میں ڈوبا ہوا اک ساز ہے

آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم
میری میخواری ابھی تک راز ہے

ہنس دئے وہ میرے رونے پر مگر
ان کے ہنس دینے میں بھی اک راز ہے

چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

حسن کو ناحق پشیماں کر دیا
اے جنوں یہ بھی کوئی انداز ہے

ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجازؔ
وہ تو آوازِ شکستِ ساز ہے

سنہ ۱۹۳۱ء

غزل

نگاہِ لطف مت اُٹھ خوگرِ آلام رہنے دے
ہمیں ناکام رہنا ہے ہمیں ناکام رہنے دے

کسی معصوم پر بیداد کا الزام کیا معنی
یہ وحشت خیز باتیں عشقِ بدانجام رہنے دے

ابھی رہنے دے دلمیں شوقِ شوریدہ کے ہنگامے
ابھی سر میں محبّت کا جنونِ خام رہنے دے

ابھی رہنے دے کچھ دن لطفِ نغمہ مستی صہبا
ابھی یہ ساز رہنے دے ابھی یہ جام رہنے دے

۲۳

کہاں تک حُسن بھی آخر کرے پاسِ رواداری
اگر یہ عشق خود ہی فرقِ خاص و عام رہنے دے

بہ ایں رندی مجاز اک شاعرِ مزدور و دہقان ہے
اگر شہروں میں وہ بدنام ہے بدنام رہنے دے

سنہ ۱۹۳۲ء

غزل

رہِ شوق سے اب ہٹا چاہتا ہوں
کشش حُسن کی دیکھنا چاہتا ہوں

کوئی دل سا درد آشنا چاہتا ہوں
رہِ عشق میں رہنما چاہتا ہوں

تجھی سے تجھے چھیننا چاہتا ہوں
یہ کیا چاہتا ہوں یہ کیا چاہتا ہوں

خطاؤں پہ جو مجھ کو مائل کرے پھر
سزا اور ایسی سزا چاہتا ہوں

وہ مخمور نظریں، وہ مدہوش آنکھیں
خرابِ محبّت ہوا چاہتا ہوں

وہ آنکھیں جھکیں وہ کوئی مسکرایا
پیامِ محبّت سُنا چاہتا ہوں

تجھے ڈھونڈتا ہوں تری جستجو ہے
مزا ہے کہ خود گم ہوا چاہتا ہوں

یہ موجوں کی بیتابیاں کون دیکھے
میں ساحل سے اب لوٹنا چاہتا ہوں

کہاں کا کرم اور کیسی عنایت
مجازؔ اب جفا ہی جفا چاہتا ہوں

۱۹۳۲ء

غزل

خامشی کا تو نام ہوتا ہے ورنہ یوں بھی کلام ہوتا ہے
عشق کو پوچھتا نہیں کوئی حسن کا احترام ہوتا ہے
آنکھ سے آنکھ جب نہیں ملتی دل سے دل ہمکلام ہوتا ہے
حسن کو شرمسار کرنا ہی عشق کا انتقام ہوتا ہے

اللہ اللہ یہ نازِ حسنِ مجازؔ
انتظارِ سلام ہوتا ہے

۱۹۳۲ء

ایک دوست کی "خوش مذاقی پر"

ہو نہیں سکتا نزی اس "خوش مذاقی کا جواب
شام کا دِل کش سماں اور تیرے ہاتھ میں کتاب
رکھ بھی دے اب اس کتابِ خشک کو بالائے طاق
اڑ رہا ہی رنگ و بُو کی بزم میں تیرا مذاق
چھپ رہا ہی پردۂ مغرب میں مہرِ زر فشاں
دید کے قابل ہیں بادل میں شفق کی سُرخیاں
موجزن جُوئے شفق ہے اس طرح زیرِ سحاب
جس طرح رنگین شیشوں میں جھلکتی ہی شراب
اک نگارِ آتشیں ہر شے پہ ہے چھایا ہوا
جیسے عارض پر عروسِ نو کے ہو رنگِ حیا

شانۂ گیتی پہ لہرانے کو ہیں گیسوئے شب
آسماں پر منعقد ہونے کو ہے بزمِ طرب
اُڑ رہے ہیں جستجو میں آشیانوں کے طیور
آچلا ہے آئینے میں چاند کے ہلکا سا نُور

دیکھ کر یہ شام کے نظارہ ہائے دل نشیں
کیا ترے دل میں ذرا بھی گدگدی ہوتی نہیں
کیا تری نظروں کو یہ رنگینیاں بھاتی نہیں
کیا ہوائے سرد تیرے دل کو تڑپاتی نہیں
کیا نہیں ہوتی تجھے محسوس مجھ کو سچ بتا
تیز جھونکوں میں ہوا کے گنگنانے کی صدا
سبزہ و گُل دیکھ کر تجھ کو خوشی ہوتی نہیں
اُف ترے احساس میں اتنی بھی رنگینی نہیں
حُسنِ فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں
میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں

سنہ ۱۹۳۲ء

نغمۂ ٹیگور

(ترجمہ از گارڈنر)

میں نے ہنگامِ صبح، اے دنیا   تیرے گلشن سے ایک گُل توڑا
اپنے سینے پہ دی جگہ اُس کو   چُبھ گیا دل میں لیکن اک کانٹا
شام ہوتے ہی میں نے یہ دیکھا   گُل تھا پژمردہ درد باقی تھا
حُسن و خوشبو میں اک سے اک بڑھکر   اور بھی ہوں گے تجھ میں گُل پیدا
میری گل چینیوں کا وقت مگر   ایک مدّت ہوئی کہ ختم ہوا
اور اب جبکہ رات طاری ہے
گُل نہیں پاس درد باقی ہے

سنہ ۱۹۳۲ء

غزل

یہ میری دنیا یہ میری ہستی　　نغمہ طرازی، صہبا پرستی
شاعر کی دنیا، شاعر کی ہستی　　یا نالۂ غم، یا شورِ مستی
سب سے گریزاں، سب پر پرستی　　آنکھوں کی مستی مہنگی نہ سستی
یا خلد و ساقی لے جذبِ مستی　　یا ٹکڑے ٹکڑے دامانِ ہستی
محوِ سفر ہوں، گرمِ سفر ہوں　　مری نظر میں رفعت نہ پستی
ان انکھڑیوں کا عالم نہ پوچھو　　صہبا ہی صہبا، مستی ہی مستی
وہ آ بھی جاتے وہ ہو بھی جاتے　　چشمِ تمنّا پھر بھی ترستی

اُن کا کرم ہے ان کی محبت
کیا میرے نغمے کیا میری ہستی

۱۹۳۲ء

غزل

سینے میں اُن کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں

تاثیرِ جذبِ شوق دکھائے ہوئے تو ہیں
ہم تیرا ہر حجاب اٹھائے ہوئے تو ہیں

ہاں کیا ہوا وہ حوصلۂ دید اہلِ دل
دیکھو نا وہ نقاب اٹھائے ہوئے تو ہیں

تیرے گناہگار، گناہگار ہی سہی
تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں

اللہ ری کامیابی آوارگانِ عشق
خود گم ہوئے تو کیا اسے پائے ہوئے تو ہیں

یوں تجکو اختیار ہے تاثیر دے نہ دے
دستِ دعا ہم آج اٹھائے ہوئے تو ہیں

ذکر اُن کا گر زباں پہ نہیں ہے تو کیا ہوا
اب تک نفس نفس میں سمائے ہوئے تو ہیں

مٹتے ہوؤں کو دیکھ کے کیوں رو نہ دیں مجازؔ
آخر کسی کے ہم بھی مٹائے ہوئے تو ہیں

۱۹۳۲ء

غزل

عیش سے بے نیاز ہیں ہم لوگ
بے خودِ سوز و ساز ہیں ہم لوگ

جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو
تیرے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ

بے سبب التفات کیا معنی؟
کچھ تو اے چشمِ ناز ہیں ہم لوگ

محفلِ سوز و ساز ہے دنیا!
حاصلِ سوز و ساز ہیں ہم لوگ

کوئی اس راز سے نہیں واقف
کیوں سراپا نیاز ہیں ہم لوگ

ہم کو رسوا نہ کر زمانے میں
بسکہ تیرا ہی راز ہیں ہم لوگ
سب اسی عشق کے کرشمے ہیں
ورنہ کیا اے مجازؔ ہیں ہم لوگ

۱۹۳۳ء

غزل

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیِ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم!
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

رودادِ غمِ اُلفت اُن سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہی کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی!
محفل تو تری سُونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اُس محفلِ کیف و مستی میں اُس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

۱۹۳۳ء

آج کی رات

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات

اور کیا چاہیئے اب اے دلِ مجروح تجھے!
اس نے دیکھا تو بہ اندازِ دگر آج کی رات

پھول کیا خار بھی ہیں آج گلستاں بکنار!
سنگریزے ہیں نگاہوں میں گہر آج کی رات

محوِ گلگشت ہے یہ کون مرے دوش بدوش
کہکشاں بنگئی ہر راہ گزر آج کی رات

پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلابِ نشاط
اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات

شبنمستان تجلّی کا فسوں کیا کہیئے!
چاند نے پھینک دیا رختِ سفر آج کی رات

نُور ہی نُور ہے کس سمت اُٹھاؤں آنکھیں
حُسن ہی حُسن ہے تا حدِ نظر آج کی رات

قصرِ گیتی میں اُمنڈ آیا ہے طوفانِ حیات
موت لرزاں ہے پسِ پردہ آج کی رات

اللہ اللہ وہ پیشانیِ سیمیں کا جمال!
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات

عارضِ گرم پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں
وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات

نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار!
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

نغمہ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہیئے!
گھر مرا بن گیا خیّام کا گھر آج کی رات

میری ہر سانس پہ وہ ان کی توجہ کیا خوب!
میری ہر بات پہ وہ جنبشِ سر آج کی رات

وہ تبسم ہی تبسّم کا جمالِ پیہم!
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

اُف وہ وارفتگیٔ شوق میں اک وہمِ لطیف!
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پہ نظر آج کی رات

اپنی رفعت پہ جو نازاں ہیں تو نازاں ہی رہیں
کہہ دو انجم سے کہ دیکھیں نہ اِدھر آج کی رات

اُن کے الطاف کا اتنا ہی فسوں کافی ہے
کم ہے پہلے سے بہت دردِ جگر آج کی رات

سنہ ۱۹۳۳ء

نذرِ خالدہ

(مُسلم یُونیورسٹی یُونین ہال میں خالدہ ادیب خانم کا خیر مقدم)

دل مسرّت کی فراوانی سے دیوانہ ہے آج
دیکھنا یہ کون آخر زیبِ کاشانہ ہی آج

کیفِ صہبائے طرب میں غرق میخانہ ہی آج
ہر شجر ساقیِ مے ہر پھُول پیمانہ ہی آج

غنچہ و گُل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی
اس گلستاں میں بہار اس دُھوم سی آئی نہ تھی

نرگسِ مخمور ہے لذتِ کشِ خوابِ نشاط
پھُوٹ نکلا ہی گل و نسرین سی سیلابِ نشاط

اہلِ محفل کے لئے مشکل ہے اب تابِ نشاط
آج پیمانوں سے چھلکے گی مے نابِ نشاط

پرفشاں ہے جذبۂ پنہاں ابھرنے کے لئے
مضطرب ہے ذرّہ ذرّہ رقص کرنے کے لئے

پھر ادھر آئے نہ آئے یہ شمیمِ جاں فزا
پھر میسّر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا

چھیڑ اس انداز سے اے مطربِ رنگیں نوا
ٹوٹ جائے آج اک اک تار تیرے ساز کا

ذکر جس کا زہرہ و پروین کے کاشانے میں ہے
وہ صنم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے

خالدہ تُو ہے بہشتِ ترکمانی کی بہار
تیری پیشانی پہ نُورِ حرّیت آئینہ کار

تیرے رُخ سے پرتوِ معصُوم مریم آشکارا
تیرے جلوؤں کی صباحت سے فرشتے شرمسار

گُل پشیماں قلبِ بلبل رشک سے دو نیم ہے
تیری باتوں میں خمارِ کوثر و تسنیم ہے

یوں تو ہم ہر شمعِ علم و فن کے پروانے رہے
یہ حقیقت ہے کہ ہم تیرے بھی دیوانے رہے

مدتوں اپنی زباں پر تیرے افسانے رہے
تو رہی بیگانہ لیکن ہم نہ بیگانے رہے

یاد تیری اک زمانے سے ہمارے دل میں تھی
تو یہاں آنے سے پہلے بھی اسی محفل میں تھی

شوق کی شورش جمال و نور کا سیلاب ہے
ہر کلی سازِ طرب ہے ہر نظر مضراب ہے

آنکھ حیراں روحِ اربابِ وفا بیتاب ہے
یہ ہمارے خواب کی تعبیر ہے یا خواب ہے

لالہ و گل کیا چمن بھی تیرے قدموں پر نثار
یہ گہرہائے سخن بھی تیرے قدموں پر نثار

اے مقدس حور اے پروردۂ موجِ نسیم
روحِ عشرت گاہِ ساحل جانِ طوفانِ عظیم

تو نے ترکوں کو دکھائی ہے صراطِ مستقیم
پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجاباتِ قدیم

ضعف دکھلایا ہی جب بھی فطرتِ احرار نے
آگ برسادی ہی تیرے نطقِ گوہر بار نے
رہ چکی ہی ہاتھ میں تیرے وہ تیغِ بے نیام
جس کی جنبش نے بدل ڈالا حکومت کا نظام
ترکِ افتادہ کو تونے ہی دیا اذنِ خرام
تیرے ہی ہاتھوں نے چھلکائے ہیں آزادی کے جام
تونے جو احساں کئے ہیں ملّتِ احرار پر
نقش ہیں اب تک سمرنا کے در و دیوار پر
ہاں بتادے ہم کو بھی اے رُوحِ اربابِ نیاز
کس طرح مٹتا ہی آخر رنگِ و خوں کا امتیاز
دل پہ کیونکر فاش ہو جاتے ہیں آزادی کے راز
چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا ساز
تیری آنکھوں میں سرورِ عشرتِ جمہور ہے
آہ یہ جوہر ہماری دسترس سی دُور ہے
محرمِ درد و مسرّت رازدارِ صبح و شام
محفلِ فطرت کی خاموشی ہی تجھ سی ہم کلام

تیری ہستی آسمانِ ترک کا ماہِ تمام
تو محبت، ہر نفس تیرا محبت کا پیام
گلشنِ مشرق میں مانندِ صبا آئی ہے تو!
صبحِ روشن کا پیامِ جانفزا لائی ہے تو!
قربتِ گُل کس قدر جاں بخش ہی خاروں سی پوچھ
چاند کی تنویر میں کیا لطف ہی تاروں سی پوچھ
نشۂ صہبا میں کیا لذت ہی میخواروں سی پوچھ
چارہ سازی میں مزا کیا ہی یہ بیماروں سی پوچھ
رُوح و دل کو جگمگا دے جلوہ آرائی تری
کم سے کم اتنا تو کر جائے مسیحائی تری
کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہی ہمیں
فرشِ گُل سی دُور انگاروں پہ چلنا ہی ہمیں
خارزارِ غم کو پیروں سے کچلنا ہی ہمیں
جادۂ منزل میں گرنا ہی سنبھلنا ہے ہمیں
درس ایسا دے کہ دل آزردۂ منزل نہ ہو
فکر لاحاصل نہ ہو، اندیشۂ باطل نہ ہو

۱۹۳۳ء

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی

ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی

تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی

جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی

نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی

ٹھوکریں کھاکر، لچکتی، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی

ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی

رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی
پٹڑیوں پر دُور تک سیماب چھلکاتی ہوئی

جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی

منتشر کر کے فضا میں جابجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی

تیز تر ہوتی ہوئی منزل بمنزل دم بہ دم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی رُوپ دکھلاتی ہوئی

سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی

اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے
رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی

اِک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی

رعشہ بر اندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی!

یاد آجائے پُرانے دیوتاؤں کا جلال
اِن قیامت خیزیوں کیساتھ بَل کھاتی ہوئی

ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کیساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی

مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی

اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طُور دکھلاتی ہوئی

جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی

چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی

رینگتی ، مڑتی ، مچلتی ، تلملاتی ، ہانپتی
اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی

خودبخود روٹھی ہوئی ، بپھری ہوئی ، بکھری ہوئی
شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی

پُل پہ دریا کے دمادم کوندتی للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذرّوں کو چمکاتی ہوئی

مُنہ میں گھُستی ہی سرنگوں کے یکایک دوڑ کر
دندناتی ، چیختی ، چنگھاڑتی ، گاتی ہوئی

آگے آگے "جستجو آمیز" نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی ، سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی
تیزیٔ رفتار کے سکے جماتی جابجا
دشت و دَر میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی

ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی

صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دل کش خواب دکھلاتی ہوئی

ڈالتی بے حِس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی

دامنِ تاریکیٔ شب کی اڑاتی دھجیاں
قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی

زد میں کوئی چیز آ جائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی

زعم میں پیشانیٔ صحرا پہ ٹھوکر مارتی!
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی

ایک سرکش فوج کی صورت عَلَم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ درّاتی ہوئی

ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی

ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کیساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی

وہ ہوا میں سینکڑوں جنگی ڈہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جانفزا آواز لہراتی ہوئی

الغرض اڑتی چلی جاتی ہو بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

۱۹۳۳ء

اِنقلاب

چھوڑ دے مطرب بس اب لللہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے
تیری تانوں میں ہے ظالم کس قیامت کا اثر
بجلیاں سی گر رہی ہیں خرمنِ ادراک پر
یہ خیال آتا ہے رہ رہ کر دلِ بیتاب میں
بہہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں
چھوڑ کر آیا ہوں کس مشکل سے میں جام و سبو!
آہ کس دل سے کیا ہے میں نے خونِ آرزو
پھر شبستانِ طرب کی راہ دکھلاتا ہے تو
مجھ کو کرنا چاہتا ہے پھر خرابِ رنگ و بو

میں نے مانا وجد میں دنیا کو لا سکتا ہے تُو
میں نے یہ مانا غمِ ہستی مٹا سکتا ہے تُو

میں نے مانا تیری موسیقی ہی اتنی پُر اثر
جھُوم اٹھتے ہیں فرشتے تک ترے نغمات پر

ہاں یہ سچ ہی زمزمے تیرے مچلتے ہیں وہ دھُوم
جھُوم جاتے ہیں مناظر، رقص کرتے ہیں نجوم

تیرے ہی نغمے سے وابستہ نشاطِ زندگی
تیرے ہی نغمے سے کیف و انبساطِ زندگی

تیری صوتِ سرمدی باغِ تصوّف کی بہار
تیرے ہی نغموں سے بےخود عابدِ شب زندہ دار

بلبلیں نغمہ سرا ہیں تیری ہی تقلید میں
تیرے ہی نغموں سے دھومیں محفلِ ناہید میں

مجھ کو تیرے سحرِ موسیقی سے کب انکار ہے
مجھ کو تیرے لحنِ داؤدی سے کب انکار ہے

بزمِ ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ

فرشِ گیتی سے سکوں اب مائل پرواز ہے
ابر کے پردوں میں سازِ جنگ کی آواز ہے
پھینکدے اے دوست اب بھی پھینکدے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب
آرہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
کوہ و صحرا میں زمیں سے خون ابلے گا ابھی
رنگ کے بدلے گلُوں سے خون ٹپکے گا ابھی
بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دراّتے ہوئے
اک جنوں انگیز لَے میں جانے کیا گاتے ہوئے
سرکشی کی تُند آندھی دم بدم چڑھتی ہوئی
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی
بھوک کے مارے ہوئے انساں کی فریادوں کے ساتھ
فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ
ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام

گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستون
خون بن جائے گی شیشوں میں شرابِ لالہ گوں
خون کی بُو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خوں ہی خوں ہو گا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی
جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں
پُرسکوں صحرا میں خوں، بیتاب دریاؤں میں خوں
دیر میں خوں، مسجدیں میں خوں، کلیساؤں میں خوں
خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں
خون کی رنگینیوں میں ڈوب جائے گی بہار
ریگِ صحرا پر نظر آئیں گے لاکھوں لالہ زار
خوں سے رنگیں فضائے بوستاں ہو جائے گی
نرگسِ مخمور چشمِ خوں فشاں ہو جائے گی
کوہساروں کی طرف سے "سرخ آندھی" آئے گی
جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی

توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا!
دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
سُرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
غرق ہوں گے آتشیں ملبوس میں منظر تمام
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی، فرق پر رنگِ شفق
اور اس رنگِ شفق میں باہزاراں آب و تاب!
جگمگائے گا وطن کی حُرّیت کا آفتاب

سنہ ۱۹۳۳ء

غزل

خود دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی
ہاں لطف جب ہے پا کے بھی ڈھونڈا کرے کوئی

تم نے تو حکمِ ترکِ تمنّا سُنا دیا
کس دل سے آہ ترکِ تمنّا کرے کوئی

دنیا لرز گئی دلِ حرماں نصیب کی،
اس طرح سازِ عیش نہ چھیڑا کرے کوئی

مجھ کو یہ آرزو وہ اُٹھائیں نقاب خود
ان کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی

رنگینیٔ نقاب میں گُم ہو گئی نظر
کیا بے حجابیوں کا تقاضا کرے کوئی
یا تو کسی کو جُراَتِ دیدار ہی نہ ہو
یا پھر مری نگاہ سے دیکھا کرے کوئی
ہوتی ہے اس میں حُسن کی توہین اے مجازؔ
اتنا نہ اہلِ عشق کو رُسوا کرے کوئی

۱۹۳۳ء

شوقِ گریزاں

دیر و کعبہ کا میں نہیں قائل
دیر و کعبہ کو آستاں نہ بنا

مجھ میں تو رُوحِ سرمدی مت پھُونک
رونقِ بزمِ عارفاں نہ بنا

دشتِ ظلمات میں بھٹکنے دے
میری راہوں کو کہکشاں نہ بنا

عشرتِ جہل و تیرگی مت چھین
محرمِ رازِ دو جہاں نہ بنا

بجلیوں سی جہاں نہ ہو چشمک
اُس گلستاں میں آشیاں نہ بنا

خارِ چشمِ حریف رہنے دے
حرزِ بازوئے دوستاں نہ بنا

میری خود بینیاں نہ لے مجھ سے
جلوہ افروزِ مہوشاں نہ بنا

دلِ صد پارۂ حوادث کو
تختۂ مشقِ گل رخاں نہ بنا

میری خود داریوں کا خون نہ کر
مطربِ بزمِ دلبراں نہ بنا

ماہ و انجم سے مجھ کو کیا نسبت
مجھ کو ان کا مزا جداں نہ بنا

جس کو اپنی خبر نہیں رہتی
اُس کو سالارِ کارواں نہ بنا

میری جانب نگاہِ لطف نہ کر
غم کو اس درجہ کامراں نہ بنا

اس زمیں کو زمیں ہی رہنے دے
اِس زمیں کو تو آسماں نہ بنا

میری ہستی نیاز و شوق سہی
اِس کو عنوانِ داستاں نہ بنا

راز تیرا چھپا نہیں سکتا
تُو مجھے اپنا رازداں نہ بنا

سنہ ۱۹۳۴ء

غزل

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصوّر کیا کیجے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گُل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے، اب اُن کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

۱۹۳۴ء

تعارف

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ الفت کا طلبگار ہوں میں

عشق ہی عشق ہی دُنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

خوابِ عشرت میں ہیں اربابِ خرد
اور اک شاعرِ بیدار ہوں میں

چھیڑتی ہی جسے مضرابِ الم
سازِ فطرت کا وہی تار ہوں میں

رنگِ نظارۂ قدرت مجھ سے
جانِ رنگینئ کہسار ہوں میں

نشۂ نرگسِ خوباں مجھ سے
غازۂ عارض و رخسار ہوں میں

عیب، جو حافظ و خیّام میں تھا
ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہی تو گنہگار ہوں میں

رشکِ صد ہوش ہی مستی میری
ایسی مستی ہی کہ ہشیار ہوں میں

لے کے نکلا ہوں گہرہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں

دیر و کعبہ میں مرے ہی چرچے — اور رسوا سرِ بازار ہوں میں
کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے — اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں
اہلِ دنیا کے لئے ننگ سہی — رونقِ انجمنِ یار ہوں میں
عین اس بے سر و سامانی میں — کیا یہ کم ہے کہ گھربار ہوں میں
میری باتوں میں مسیحائی ہے — لوگ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں
مجھ سے برہم ہے مزاجِ پیری — مجرمِ شوخیٔ گفتار ہوں میں
حُور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں — نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں
محفلِ دہر پہ طاری ہے جمود — اور وارفتۂ رفتار ہوں میں

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

۱۹۳۵ء

اُن کا جشنِ سالگرہ

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہی عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہونٹوں پہ فدا رُوحِ بہارِ گُل و نسریں
آنکھوں کی چمک روکشِ بزمِ مہ و پرویں
پیراہنِ زرتار میں اک پیکرِ سیمیں

لہریں سی وہ لیتا ہوا اک پھول کا سہرا
سہرے میں جھمکتا ہوا اک چاند سا چہرا
اک رنگ سا رُخ پر کبھی ہلکا کبھی گہرا

ہر سانس میں احساس فراواں کی کہانی
خاموشیِ محجوب میں اک سیلِ معانی
جذبات کے طوفاں میں ہے دوشیزہ جوانی

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے
میزانِ جوانی میں اُسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں نظر بول رہی ہے

سرشار نگاہوں میں حیا جُھوم رہی ہے
ہیں رقص میں افلاک زمیں گھوم رہی ہے
شاعر کی وفا بڑھ کے قدم چوم رہی ہے

اے تُو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی
ہو تجھ کو مبارک یہ تری نُور جہانی
افکار سے محفوظ رہے تیری جوانی

چھلکے تری آنکھوں سی شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

سنہ ۱۹۳۵ء

خانہ بدوش

بستی سے تھوڑی دور چٹانوں کے درمیان
ٹھیرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں
ان کی کہیں زمین نہ ان کا کہیں مکاں
پھرتے ہیں یونہی شام وسحر زیر آسماں
دُھوپ اور ابر و باد کے مارے ہوئے غریب
یہ لوگ وہ ہیں جن کو غلامی نہیں نصیب
اس کارواں میں طفل بھی ہیں نوجواں بھی ہیں
بُوڑھے بھی ہیں مریض بھی ہیں ناتواں بھی ہیں
مَیلے پھٹے لباس میں کچھ دیویاں بھی ہیں
سب زندگی سے تنگ بھی ہیں سرگراں بھی ہیں

بیزار زندگی سے ہیں پیر و جواں سبھی
الطافِ شہریار کے ہیں نوحہ خواں سبھی
ماتھے پہ سخت کوشئ پیہم کی داستاں
آنکھوں میں حزن و یاس کی گھنگھور بدلیاں
چہروں پہ تازیانۂ افلاس کے نشاں
ہر ہر ادا سے بھوک کی بپتا بیاں عیاں
پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں
روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں
اٹھے ہیں جس کی گود سے آذر وہ قوم ہے
توڑے ہیں جس نے چرخ سے اختر وہ قوم ہے
پلٹے ہیں جس نے دہر کے دفتر وہ قوم ہے
پیدا کئے ہیں جس نے پیمبر وہ قوم ہے
اب کیوں شریک حلقۂ نوعِ بشر نہیں
انساں ہی تو ہیں یہ کوئی جانور نہیں
آخر زمانہ ان کو ستائے گا کب تلک؟
کب سے جلا رہا ہے جلائے گا کب تلک؟

کب سے مٹا رہا ہے مٹائے گا کب تلک؟
ان کے لہو کو جوش نہ آئے گا کب تلک؟

مایوسیوں کی تہ میں جنوں خیزیاں بھی ہیں
افلاس کی سرشت میں خونریزیاں بھی ہیں

سنہ ۱۹۳۵ء

نذرِ دل

(اُن کے نام)

اپنے دل کو دونوں عالم سے اُٹھا سکتا ہوں میں
کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھی بھُلا سکتا ہوں میں

کون تم سے چھین سکتا ہے مجھے، کیا وہم ہے
خود زلیخا سے بھی تو دامن بچا سکتا ہوں میں

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں

دفن کر سکتا ہوں سینے میں تمہارے راز کو
اور تم چاہو تو افسانہ بنا سکتا ہوں میں

میں قسم کھاتا ہوں اپنے نطق کے اعجاز کی
تم کو بزمِ ماہ و انجم میں بٹھا سکتا ہوں میں

سر پہ رکھ سکتا ہوں تاجِ کشورِ نورانیاں
محفلِ خورشید کو نیچا دکھا سکتا ہوں میں
میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں
تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لیۓ
گیت گا سکتا ہوں میں، آنسو بہا سکتا ہوں میں
جذب ہے دل میں مرے دونوں جہاں کا سوز و ساز
بربطِ فطرت کا ہر نغمہ سُنا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں!
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اٹھا سکتا ہوں میں
تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر
مجھ کو یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں
آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں!
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

۱۹۳۶ء

مجبوریاں

میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا
سکوں لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا

کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا

متاعِ سوز و سازِ زندگی پیمانہ و بربط
میں خود کو ان کھلونوں سے بھی اب بہلا نہیں سکتا

وہ بادل سر پہ چھائے ہیں کہ سر سے ہٹ نہیں سکتے
مِلا ہے درد وہ دل کو کہ دل سے جا نہیں سکتا

ہوس کاری ہے جُرمِ خودکشی میری شریعت میں
یہ حدِّ آخری ہے میں یہاں تک جا نہیں سکتا

نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اُس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اُس کو پُوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا

یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اس کے گیت بھی جی کھولکر میں گا نہیں سکتا

زباں پر بیخودی میں نام اُس کا آ ہی جاتا ہے
اگر پُوچھے کوئی، یہ کون ہے؟ بتلا نہیں سکتا
کہاں تک قصۂ آلامِ فرقت مختصر یہ ہے
یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں جا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بِن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

۱۹۳۶ء

نورا

(نرس کی چارہ گری)

وہ نوخیز نورا وہ اک بنتِ مریم
وہ مخمور آنکھیں وہ گیسوئے پر خم

وہ ارضِ کلیسا کی اک ماہ پارہ
وہ دیر و حرم کے لئے اک شرارہ

وہ فردوسِ مریم کا اِک غنچۂ تر
وہ تثلیث کی دخترِ نیک اختر

وہ اک نرس تھی چارہ گر جسکو کہیئے
مداوائے دردِ جگر جس کو کہیئے

جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی
ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی

وہ پُر رعب تیور وہ شاداب چہرہ
متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ

مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پہ
یہ تحریر تھا صاف اُس کی جبیں پر

سفید اور شفاف کپڑے پہن کر
مرے پاس آتی تھی اک حُور بن کر

وہ اک آسمانی فرشتہ تھی گویا
کہ انداز تھا اُس میں جبریل کا سا

وہ اک مرمریں حُور خُلدِ بریں کی
وہ تعبیر آذر کے خوابِ حسیں کی

وہ تسکینِ دل تھی سکونِ نظر تھی
نگارِ شفق تھی جمالِ سحر تھی

وہ شعلہ، وہ بجلی، وہ جلوہ، وہ پرتو
سلیماں کی وہ اک کنیز سبک رو

کبھی اُس کی شوخی میں سنجیدگی تھی
کبھی اُس کی سنجیدگی میں بھی شوخی

گھڑی چپ، گھڑی کرنے لگتی تھی باتیں
سرہانے مرے کاٹ دیتی تھی راتیں

عجب چیز تھی وہ عجب راز تھی وہ
کبھی سوز تھی وہ، کبھی ساز تھی وہ

نقاہت کے عالم میں جب آنکھ اُٹھتی
نظر مجھ کو آتی محبّت کی دیوی

وہ اُس وقت اک پیکرِ نُور ہوتی
تخیّل کی پرواز سے دُور ہوتی

وہ انجیل پڑھ کر سُناتی تھی مجھ کو
ہنساتی تھی مجھ کو رُلاتی تھی مجھ کو

دوا اپنے ہاتھوں سے مجھ کو پلاتی
"اب اچھے ہو" ہر روز مژدہ سُناتی

سرہانے مرے ایک دن سر جھکائے
وہ بیٹھی تھی تکیے پہ کہنی ٹکائے

خیالاتِ پیہم میں کھوئی ہوئی سی
نہ جاگی ہوئی سی نہ سوئی ہوئی سی

جھپکتی ہوئی بار بار اس کی پلکیں
جبیں پُر شکن بیقرار اس کی پلکیں

وہ آنکھوں کے ساغر چھلکتے ہوئے سے
وہ عارض کے شعلے بھڑکتے ہوئے سے

لبوں میں تھا لعل و گہر کا خزانہ
نظر عارفانہ، ادا راہبانہ

مہک گیسوؤں سے چلی آ رہی تھی
مرے ہر نفس میں بسی جا رہی تھی

مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سُوجھی
جو سُوجھی بھی تو کس قیامت کی سُوجھی

ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
لبِ لعلِ افشاں سے اک شے چرا لی

وہ شے جس کو اب کیا کہوں کیا سمجھئے
بہشت جوانی کا تحفہ سمجھئے

شرابِ محبت کا اِک جامِ رنگیں
شبو زارِ فطرت کا اِک جامِ رنگیں

میں سمجھا تھا شاید بگڑ جائے گی وہ
ہواؤں سے لڑتی ہے لڑ جائے گی وہ

میں دیکھوں گا اُس کے بِپھرنے کا عالم
جوانی کا غصّہ بکھرنے کا عالم

اِدھر دل میں اک شورِ محشر بپا تھا
مگر اُس طرف رنگ ہی دوسرا تھا

ہنسی اور ہنسی اس طرح کھلکھلا کر
کہ شمعِ حیا رہ گئی جھلملا کر

نہیں جانتی ہے مرا نام تک وہ
مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ

یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر
کہ کس روز آؤ گے بیمار ہو کر

۱۹۳۶ء

ننھی پجارن

اک ننھی منی سی پجارن — پتلی باہیں، پتلی گردن
بھور بھئے مندر آئی ہے — آئی نہیں ہے ماں لائی ہے
وقت سے پہلے جاگ اٹھی ہے — نیند ابھی آنکھوں میں بھری ہے
ٹھوڑی تک لٹ آئی ہوئی ہے — یونہی سی لہرائی ہوئی ہے
آنکھوں میں تاروں کی چمک ہے — مکھڑے پہ چاندی کی جھلک ہے
کیسی سندر ہے کیا کہیئے — ننھی سی اک سیتا کہیئے
دھوپ چڑھے تارا چمکا ہے — پتھر پر اک پھول کھلا ہے
چاند کا ٹکڑا پھول کی ڈالی — کمسن سیدھی بھولی بھالی
کان میں چاندی کی بالی ہے — ہاتھ میں پیتل کی تھالی ہے

دل میں لیکن دھیان نہیں ہے　　پوجا کا کچھ گیان نہیں ہے
کیسی بھولی اور سیدھی ہے　　مندر کی چھت دیکھ رہی ہے
ماں بڑھ کر چٹکی لیتی ہے　　چپکے چپکے ہنس دیتی ہے
ہنسنا رونا اس کا مذہب　　اُس کو پوجا سے کیا مطلب

خود تو آئی ہے مندر میں
من اُس کا ہے گڑیا گھر میں

سنہ ۱۹۳۶ء

نذرِ علیگڈھ

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغرِ نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حُسن ٹپکتا ہے پھُولوں سے جوانی اُبلتی ہے
جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اِس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات اُبلتی ہے
اسلام کے اس بُت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی
یاں حُسن کی برق چمکتی ہے، یاں نُور کی بارش ہوتی ہے
ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے ہر اشک یہاں اک موتی ہے

ہر شام ہے شامِ مصر یہاں ، ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں

یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا ، یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا یہ خُلدِ بریں ارمانوں کی

فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں ، پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں ، چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں

اس فرش سے ہم نے اُڑ اُڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی ، پروین سے رشتے جوڑے ہیں

اِس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اِس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں

اس بزم میں نیزے پھینکے ہیں اس بزم میں خنجر چُومے ہیں
اس بزم میں گر کر تڑپے ہیں اس بزم میں پی کر جھُومے ہیں

آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے

یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اتارے ہیں

ہر آہ ہے خود تاثیر یہاں ہر خواب ہی خود تعبیر یہاں
تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہی تقدیر یہاں
ذرّات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکستِ فاش یہاں
اس گلکدۂ پارینہ میں پھر آگ بھڑکنے والی ہے
پھر ابر گرجنے والے ہیں، پھر برق کڑکنے والی ہے
جو ابر یہاں سے اٹھے گا، وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہرِ طرب پر گرجے گا ہر قصرِ طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہی، یہ ابر ہمیشہ برسے گا

سنہ ۱۹۳۶ء

دِلّی سے واپسی

رخصت اے دِلّی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں نالہ بہ لب جاتا ہوں میں

یاد آئیں گے مجھے تیرے زمین و آسماں
رہ چکے ہیں میری جولانگاہ تیرے بوستاں

تیرا دل دھڑکا چکے ہیں میرے احساسات بھی
تیرے ایوانوں میں گونجے ہیں میرے نغمات بھی

رشکِ شیرازِ کہن، ہندوستان کی آبرو
سرزمینِ حسن و موسیقی، بہشتِ رنگ و بُو

معبدِ حسن و محبّت، بارگاہِ سوز و ساز
تیرے بتخانے حسیں، تیرے کلیسا دلنواز

ذکرِ یوسف کا تو کیا کیجے تری سرکار میں
خود زلیخا آکے بکتی ہے ترے بازار میں
جنتیں آباد ہیں تیرے در و دیوار میں
اور تو آباد خود شاعر کے قلبِ زار میں

محفلِ ساقی سلامت! بزمِ انجم برقرار
نازنینانِ حرم پر رحمتِ پروردگار
یاد آئے گی مجھے بے طرح یاد آئے گی تو!
عین وقتِ مے کشی آنکھوں میں پھر جائے گی تو!

کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلدِ علی گڈھ کی ہزاروں محفلیں
کتنے رنگیں عہد و پیماں توڑ کر آیا تھا میں
دل نوازانِ چمن کو چھوڑ کر آیا تھا میں

اک نشیمن میں نے چھوڑا، اک نشیمن چھٹ گیا
ساز بس چھیڑا ہی تھا میں نے کہ گلشن چھٹ گیا
دل میں سوزِ غم کی اک دنیا لیے جاتا ہوں میں
آہ تیرے میکدے سے بے پیے جاتا ہوں میں

جاتے جاتے لیکن اک پیماں کیے جاتا ہوں میں
اپنے عزمِ سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں

پھر تری بزمِ حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور باندازِ دگر آؤں گا میں

آہ وہ چکّر دیے ہیں گردشِ ایّام نے
کھول کر رکھ دی ہیں آنکھیں تلخیٔ آلام نے

فطرتِ دل دشمنِ نغمہ ہوئی جاتی ہے اب
زندگی اک برق، اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب

سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا
لالہ زارِ رنگ و بو میں آگ بن کر آؤں گا

۱۹۳۶ء

غزل

حُسن پھر فتنہ گر ہے کیا کہئے
دل کی جانب نظر ہے کیا کہئے

پھر وہی رہگذر ہے کیا کہئے
زندگی راہ پر ہے کیا کہئے

حُسن خود پردہ در ہے کیا کہئے
یہ ہماری نظر ہے کیا کہئے

آہ تو بے اثر تھی برسوں سے
نغمہ بھی بے اثر ہے کیا کہئے

حُسن ہے اب نہ حُسن کے جلوے
اب نظر ہی نظر ہے کیا کہئے

آج بھی ہے مجازؔ خاک نشیں
اور نظر عرش پر ہے کیا کہئے

سنہ ۱۹۳۶ء

بربطِ شکستہ

اُس نے جب کہا مجھ سے گیت اک سُنا دو نا
سرد ہے فضا دل کی، آگ تم لگا دو نا
کیا حسین تیور تھے، کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو تھی، حسرت تھی، حکم تھا، تقاضا تھا
گنگنا کے مستی میں ساز لے لیا میں نے
چھیڑ ہی دیا آخر نغمۂ وفا میں نے
یاس کا دھواں اٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربطِ شکستہ سے

سنہ ۱۹۳۷ء

مُسافر

مُسافر یونہی گیت گائے چلا جا
سرِ رہگزر کچھ سُنائے چلا جا

تری زندگی سوز و سازِ محبّت
ہنسائے چلا جا رُلائے چلا جا

ترے زمزمے ہیں خنک بھی تپاں بھی
لگائے چلا جا بجھائے چلا جا

کوئی لاکھ روکے کوئی لاکھ ٹوکے
قدم اپنے آگے بڑھائے چلا جا

حسیں بھی تجھے راستے میں ملیں گے
نظر مت ملا، مسکرائے چلا جا

محبّت کے نقشے تمنّا کے خاکے
بنائے چلا جا، مٹائے چلا جا

قدامت حدیں کھینچتی ہی رہیگی
قدامت کی بنیاد ڈھائے چلا جا

قسم شوق کی فطرتِ مضطرب کی
یونہی نت نئی دھن میں گائے چلا جا

جو پرچم اُٹھا ہی لیا سرکشی کا!
اسے آسمان تک اُڑائے چلا جا

۱۹۳۷ء

اندھیری رات کا مُسافر

جوانی کی اندھیری رات ہی ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں سے نورِ ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہی، اہرمن محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

غم و حرماں کی یورش ہی مصائب کی گھٹائیں ہیں
جنوں کی فتنہ خیزی حُسن کی خونیں ادائیں ہیں
بڑی پُر زور آندھی ہی، بڑی کافر بلائیں ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گزشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

زمیں چیں بر جبیں ہے آسماں تخریب پر مائل
رفیقانِ سفر میں کوئی بسمل ہے، کوئی گھائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں، چٹانیں راہ میں حائل
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

افق پر زندگی کے لشکرِ ظلمت کا ڈیرا ہے
حوادث کے قیامت خیز طوفانوں نے گھیرا ہے
جہاں تک دیکھ سکتا ہوں اندھیرا ہی اندھیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

چراغِ دیر، فانوسِ حرم، قندیلِ رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیازِ نُورِ عرفانی
نہ ناقوسِ برہمن ہے، نہ آہنگِ حدی خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

تلاطم خیز دریا، آگ کے میدان حائل ہیں
گرجتی آندھیاں، بپھرے ہوئے طوفان حائل ہیں
تباہی کے فرشتے جبر کے شیطان حائل ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں شعلہ افشاں دیوِ استبداد کا خنجر
سیاست کی سنانیں اہلِ زر کے خونچکاں تیور
فریبِ بیخودی دیتے ہوئے بلور کے ساغر
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

بدی پر بارشِ لطف و کرم، نیکی پہ تعزیریں
جوانی کے حسیں خوابوں کی ہیبت ناک تعبیریں
نکیلی تیز سنگینیں ہیں، خوں آشام شمشیریں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

حکومت کے مظاہر جنگ کے پُرہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ، بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل، تازیانے، بیڑیاں پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

افق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہ اِک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلبِ گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

ؔنا کے آہنی وحشت اثر قدموں کی آہٹ ہے
ِھوئیں کی بدلیاں ہیں گولیوں کی سنسناہٹ ہے
ِل کے قہقہے ہیں زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

۱۹۳۷ء

طِفلی کے خواب

طِفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں
اک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں

دل ہو اسیرِ گیسوئے عنبر سرشت میں
اُلجھے انھیں حسین سلاسل میں ہم بھی ہوں

چھیڑا ہے ساز حضرتِ سعدی نے جس جگہ
اُس بوستاں کے شوخ عنادل میں ہم بھی ہوں

گائیں ترانے دوشِ ثریّا پہ رکھ کے سر
تاروں سے چھیڑ ہو مہِ کامل میں ہم بھی ہوں

آزاد ہو کے کشمکشِ علم سے کبھی
آشفتگانِ عشق کی منزل میں ہم بھی ہوں

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں
دلدادگانِ شعلۂ محمل میں ہم بھی ہوں!

دل کو ہو شاہزادیٔ مقصد کی دُھن لگی
حیراں سُراغِ جادۂ منزل میں ہم بھی ہوں

صحرا ہو، خار زار ہو، وادی ہو، آگ ہو،
اک دن انھیں مہیب منازل میں ہم بھی ہوں

دریائے حشر خیز کی موجوں کو چیر کر
کشتی بسمت دامنِ ساحل میں ہم بھی ہوں

اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغِ آب دار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

قدموں پہ جن کے تاج ہیں اقلیمِ دہر کے
اُن چند کشتگانِ غمِ دل میں ہم بھی ہوں

سنہ ۱۹۳۷ء

نوجوان سے

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اُٹھے وہ شباب پیدا کر

ترے خرام میں ہے زلزلوں کا رازِ نہاں
ہر ایک گام پر اک انقلاب پیدا کر

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر

بہت لطیف ہے اے دوست تیغ کا بوسہ
یہی ہے جانِ جہاں اس میں آب پیدا کر

ترے قدم پہ نظر آئے محفلِ انجم
وہ بانکپن وہ اچھوتا شباب پیدا کر
ترا شباب امانت ہی ساری دنیا کی
تُو خار زارِ جہاں میں گلاب پیدا کر
سکون خواب ہی بے دست و پا ضعیفی کا
تُو اضطراب ہی خُود اضطراب پیدا کر
نہ دیکھ زہد کی تو عصمتِ گُنہ آلود
گنہ میں فطرتِ عصمت مآب پیدا کر
ترے جلو میں نئی جنتیں نئے دوزخ
نئی جزائیں انوکھے عذاب پیدا کر
شراب کھینچی ہی سب نے غریب کی خوں سی
تُو اب امیر کے خوں سی شراب پیدا کر
گرا دے قصرِ تمدّن کہ اک فریب ہی یہ
اٹھا دے رسمِ محبّت، عذاب پیدا کر
جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

بہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر
اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر
تُو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

۱۹۳۷ء

نوجوان خاتون سے

حجابِ فتنہ پرور اب اُٹھا لیتی تو اچھّا تھا
خود اپنے حُسن کو پردا بنا لیتی تو اچھّا تھا

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھّا تھا

تری چینِ جبیں خود اک سزا قانونِ فطرت میں
اسی شمشیر سے کارِ سزا لیتی تو اچھّا تھا

یہ تیرا زرد رخ، یہ خشک لب، یہ وہم، یہ وحشت
تُو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھّا تھا

دلِ مجروح کو مجروح تر کرنے سے کیا حاصل؟
تو آنسو پونچھ کر اب مُسکرا لیتی تو اچھّا تھا

ترے زیرِ نگیں گھر ہو، محل ہو، قصر ہو، کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا

اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل؟
بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارہ ہے
اگر تو سازِ بیداری اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

عیاں ہیں دشمنوں کے خنجروں پر خون کے دھبے
انھیں تُو رنگِ عارض سے ملا لیتی تو اچھا تھا

سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تُو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اِک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

۱۹۳۷ء

اثر باقی نہیں مفلوج پیروں کی دعاؤں میں
طوفانِ بلا کشی کی دعا لیتی تو اچھا تھا۔

پردہ اورِ عصمت

جو ظاہر نہ ہو وہ لطافت نہیں ہے
جو پنہاں رہے وہ صداقت نہیں ہے
یہ فطرت نہیں ہے مشیت نہیں ہے
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

صبا اور گلستاں سے دامن کشیدہ
نوائے فسوں خیز اور ناشنیدہ
تجلیِ رُخسار اور نادمیدہ
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

سرِ رہگذر چھپ چھپا کر گزرنا
خود اپنے ہی جذبات کا خون کرنا
حجابوں میں جینا، حجابوں میں مرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

خیالاتِ مبہم میں ہر وقت گم سم
دلِ نرم و نازک پہ ابرِ توہّم
بجھا سا تبسّم گھٹا سا تکلّم
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

وہ اِک کاہشِ تلخ ہر آن دل میں
وہ شام و سحر ایک خلجان دل میں
اُمنڈتا ہوا ایک طوفان دل میں
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

نگاہوں کی دعوت کو پامال کرنا
مذاقِ لطافت کو پامال کرنا
تقاضائے فطرت کو پامال کرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

قسم انجمِ شب کے ذوقِ سفر کی
قسم تازگیٔ نسیمِ سحر کی
قسم آسمانوں کے شمس و قمر کی
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

قسم شوخیٔ عشقِ سنجوگتا کی
قسم جون کے عزمِ صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی، قسم خالدہ کی
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

سنہ ۱۹۳۷ء

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی!
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہُوک سی سینے میں اُٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مِل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہی مرا عہدِ وفا میرے لئے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہی کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
اُن کو پا سکتا ہوں میں، یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہی، یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہی آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہی یہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سی خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہی جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھکر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونکدوں
اِس کا گُلشن پھونکدوں، اُس کا شبستاں پھونکدوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونکدوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

۱۹۳۷ء

سرمایہ داری

کلیجہ پُھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمہیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ وہ آندھی ہے جس کی رَو میں مُفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زَد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چُوس لیتی ہے
یہ انسانی بَلا خود خونِ انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک، موت سے بڑھکر بھیانک ہے
نہ دیکھے ہیں بُرے اِسنے نہ پرکھے ہیں بھلے اِسنے
شکنجوں میں جکڑ کر گھونٹ ڈالے ہیں گلے اِسنے

بلائے بے اماں ہی طور ہی اس کے نرالے ہیں
کہ اس نے غیظ میں اُجڑے ہوئے گھر پھونک ڈالے ہیں
قیامت اِس کے غمزے، جان لیوا ہیں ستم اسکے
ہمیشہ سینۂ مفلس پہ پڑتے ہیں قدم اسکے
کہیں یہ خون سے فردِ مال و زر تحریر کرتی ہی
کہیں یہ ہڈیاں چُن کر محل تعمیر کرتی ہی
غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہی
محل میں ناچتی ہی رقص گاہوں میں تھرکتی ہی
بظاہر چند فرعونوں کا دامن بھر دیا اس نے
مگر گلِ باغِ عالم کو جہنّم کر دیا اس نے
درندے سر جھکا دیتے ہیں لوہا مان کر اِس کا
نظر سفّاک تر اس کی، نفس مکروہ تر اِس کا
جدھر چلتی ہی بربادی کے ساماں ساتھ چلتے ہیں
نحوست ہمسفر ہوتی ہی شیطان ساتھ چلتے ہیں
یہ اکثر لوٹ کر معصوم انسانوں کو راہوں میں
خدا کے زمزمے گاتی ہی چھپ کر خانقاہوں میں

جوانمردوں کے ہاتھوں سے یہ نیزے چھین لیتی ہے
یہ ڈائن ہی بھری گودوں سی بچے چھین لیتی ہے
یہ غیرت چھین لیتی ہے، حمیت چھین لیتی ہے
یہ انسانوں سی انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے
یہ آشوبِ ہلاکت، فتنہ اسکند و دارا
زمیں کے دیوتاؤں کی کنیز انجمن آرا
ہمیشہ خون پی کر ہڈیوں کے رتھ میں چلتی ہی
زمانہ چیخ اُٹھتا ہے یہ جب پہلو بدلتی ہی
گرجتی گونجتی یہ آج بھی میداں میں آتی ہی
مگر بدمست ہے ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتی ہی
مبارک دوستو لبریز ہے اب اِس کا پیمانہ
اُٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیادِ کاشانہ

سنہ ۱۹۳۷ء

ہمارا جھنڈا

شیر ہیں چلتے ہیں دراتے ہوئے بادلوں کی طرح منڈلاتے ہوئے
زندگی کی راگنی گاتے ہوئے
آج جھنڈا ہی ہمارے ہاتھ ہیں

ہاں یہ سچ ہی بھوک سی حیران ہیں پر یہ مت سمجھو کہ ہم بے جان ہیں
اس بُری حالت میں بھی طوفان ہیں
آج جھنڈا ہی ہمارے ہاتھ ہیں

ہم وہ ہیں جو بیرخی کرتے نہیں ہم وہ ہیں جو موت سی ڈرتے نہیں
ہم وہ ہیں جو مر کے بھی مرتے نہیں
آج جھنڈا ہی ہمارے ہاتھ ہیں

چین سی محلوں میں ہم رہتے نہیں   عیش کی گنگا میں ہم بہتے نہیں
بھید دشمن سے کبھی کہتے نہیں
آج جھنڈا ہی ہمارے ہاتھ میں

جانتے ہیں ایک لشکر آئے گا   توپ دکھلا کر ہمیں دھمکائے گا
پر یہ جھنڈا بھی یونہی لہرائے گا
آج جھنڈا ہی ہمارے ہاتھ میں

کب بھلا دھمکی سی گھبراتے ہیں ہم   دل میں جو ہوتا ہی کہہ جاتے ہیں ہم
آسماں ہلتا ہے جب گاتے ہیں ہم
آج جھنڈا ہی ہمارے ہاتھ میں

لاکھ لشکر آئیں کب ہلتے ہیں ہم   آندھیوں میں جنگ کی کھلتے ہیں ہم
موت سی ہنس کر گلے ملتے ہیں ہم
آج جھنڈا ہی ہمارے ہاتھ میں

سنہ ۱۹۳۷ء

ساقی

مری مستی میں بھی اب ہوش ہی کا طور ہے ساقی
ترے ساغر میں یہ صہبا نہیں کچھ اور ہے ساقی
بھڑکتی جا رہی ہے دم بہ دم اک آگ سی دل میں
یہ کیسے جام ہیں ساقی، یہ کیسا دَور ہے ساقی
وہ شے دے جس سے نیند آ جائے عقلِ فتنہ پرور کو
کہ دل آزردۂ تمیزِ لطف و جور ہے ساقی
کہیں اک رند اور واماندۂ افکارِ تنہائی
کہیں محفل کی محفل طور سے بے طور ہے ساقی
جوانی اور یُوں گھِر جائے طوفانِ حوادث میں
خُدا رکھّے ابھی تو بے خودی کا دَور ہے ساقی

چھلکتی ہے جو تیرے جام سے اُس مے کا کیا کہنا
ترے شاداب ہونٹوں کی مگر کچھ اور ہے ساقی

مجھے پینے دے۔ پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

سنہ ۱۹۳۷ء

غزل

برباد تمنّا پہ عتاب اور زیادہ
ہاں میری محبت کا جواب اور زیادہ

روئیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

"آوارہ و مجنوں" ہی پہ موقوف نہیں کچھ
ملنے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

اٹھینگے ابھی اور بھی طوفاں مری دل سے
دیکھونگا ابھی عشق کے خواب اور زیادہ

ٹپکیگا لہو اور مرے دیدۂ تر سے
دھڑکیگا دلِ خانہ خراب اور زیادہ

ہو گی مری باتوں سے انھیں اور بھی حیرت
آئیگا انھیں مجھ سے حجاب اور زیادہ

اے مطربِ بیباک کوئی اور بھی نغمہ
اے ساقیٔ فیاض شراب اور زیادہ

۱۹۳۸ء

ایک جِلاوطن کی واپسی

پھر خبر گرم ہے وہ جانِ وطن آتا ہے
پھر وہ زندانیٔ زندانِ وطن آتا ہے
وہ خرابِ گل و ریحانِ وطن آتا ہے
مِصر سے یوسفِ کنعانِ وطن آتا ہے
"کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سُرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے"
رندِ بے کیف کو تھی بادہ و ساغر کی تلاش
ناظرِ منظرِ فطرت کو تھی منظر کی تلاش
ایک بھونرے کو خزاں میں تھی گُلِ تر کی تلاش
خود صنم خانۂ آذر کو تھی آذر کی تلاش

مژدہ اے دوست کہ وہ جانِ بہار آ پہنچا!
اپنے دامن میں لئے برق و شرار آ پہنچا!

اپنا پرچم کچھ اس انداز سے لہراتا ہے
رنگ اغیار کے چہروں سے اُڑا جاتا ہے
کوئی شاداں، کوئی حیراں، کوئی شرماتا ہے
کون یہ ساحلِ مشرق پہ نظر آتا ہے
اپنے میخانے کا اک میکشِ بیحال ہے یہ
ہاں وہی مردِ جوان بخت و جواں سال ہے یہ

مردِ سرکش تجھے آدم کی کہانی کی قسم
رُوحِ انساں کے تقاضائے نہانی کی قسم
جذبۂ عیش کی ہر شورشِ فانی کی قسم
تجھ کو اپنی اُسی بدمست جوانی کی قسم
آ کہ اک بار گلے سے تو لگا لیں تجھ کو
اپنے آغوشِ محبّت میں اٹھا لیں تجھ کو

نطق تو اب بھی ہے، پر شعلہ فشاں ہے کہ نہیں
سوزِ پنہاں سے تری رُوح تپاں ہے کہ نہیں

تجھ پہ یہ بارِ غلامی کا گراں ہے کہ نہیں
جسم میں خون جوانی کا رواں ہو کہ نہیں
اور اگر ہے تو پھر آ تیرے پرستار ہیں ہم
جنسِ آزادیٔ انساں کے خریدار ہیں ہم
ساقی و رند ترے ہیں، مے گلفام تری
اُٹھ کہ آسودہ ہو پھر حسرتِ ناکام تری
برہمن تیرے ہیں کل ملّتِ اسلام تری
صبحِ کاشی تری، سنگم کی حسیں شام تری
دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تُو جو شمشیر اُٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ
دیکھ بدلا نظر آتا ہو گلستاں کا سماں
ساغر و ساز نہ لے، جنگ کے نعرے ہیں یہاں
یہ دعائیں ہیں وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں
مائلِ جنگ نظر آتا ہے ہر مرد جواں
سرفروشانِ بلاکش کا سہارا بن جا
اُٹھ اور افلاکِ بغاوت کا ستارا بن جا

۱۹۳۸ء

مزدوروں کا گیت

محنت سے یہ مانا چُور ہیں ہم آرام سے کوسوں دُور ہیں ہم
پر لڑنے پر مجبُور ہیں ہم
مزدُور ہیں ہم! مزدُور ہیں ہم

گو آفت و غم کے مارے ہیں ہم خاک نہیں ہیں تارے ہیں
اس جگ کے راج دلارے ہیں
مزدُور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

بننے کی تمنّا رکھتے ہیں مِٹنے کا کلیجہ رکھتے ہیں
سرکش ہیں سر اُونچا رکھتے ہیں
مزدُور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

ہر چند کہ ہیں ادبار میں ہم کہتے ہیں کھلے بازار میں ہم
ہیں سب سے بڑے سنسار میں ہم
مزدُور ہیں ہم ! مزدُور ہیں ہم

جس سمت بڑھا دیتے ہیں قدم جھک جاتے ہیں شاہوں کے پرچم
ساونت ہیں ہم بلونت ہیں ہم
مزدُور ہیں ہم ! مزدور ہیں ہم

گو جان پہ لاکھوں بار بنی ! کر گزرے مگر جو جی میں ٹھنی
ہم دل کے کھرے باتوں کے دھنی
مزدُور ہیں ہم ! مزدُور ہیں ہم

ہم کیا ہیں کبھی دکھلا دیں گے ہم نظمِ کہن کو ڈھا دیں گے
ہم ارض و سما کو ہلا دیں گے
مزدُور ہیں ہم ! مزدور ہیں ہم

ہم جسم میں طاقت رکھتے ہیں سینوں میں حرارت رکھتے ہیں
ہم عزمِ بغاوت رکھتے ہیں
مزدور ہیں ہم ! مزدور ہیں ہم

جس روز بغاوت کر دیں گے دنیا میں قیامت کر دیں گے
خوابوں کو حقیقت کر دیں گے

مزدُور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

ہم قبضہ کریں گے دفتر پر ہم وار کریں گے قیصر پر
ہم ٹوٹ پڑیں گے لشکر پر

مزدُور ہیں ہم! مزدُور ہیں ہم

سنہ ۱۹۳۸ء

کِس سے محبّت ہے؟

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبّت ہے
میں جس دُنیا میں رہتا ہوں وہ اُس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بُو ہے پیکرِ حُسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہرافشانیاں اُس کی
وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثُرّیا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہِ طلعت ہے
مرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنت ہے
میری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اُسکی

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر سامانیاں اُسکی

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اِس دُنیا سے اکثر اس قدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اُسکی

جبیں پر سایہ گستر پر تو قندیلِ رُہبانی!
عذارِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی!
قدم پر لوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سلیمانی!
ازل سے معتقد ہے محفلِ نورانیاں اُسکی

ادائیں لے کے آئی ہے وہ فطرت کے خزانوں سے
جگا سکتی ہے محفل کو نظر کے تازیانوں سے
وہ ملکہ ہے خراج اُس نے لیئے ہیں بوستانوں سے
بس اک میں نے ہی اکثر کی ہیں نافرمانیاں اسکی

وہ میری جراتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہوس کی ظلمتوں پر ناز کی بجلی گرا دینا
نگاہِ شوق کی بے باکیوں پر مسکرا دینا
جنوں کو درسِ تمکیں دیگئیں نادانیاں اُسکی

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اُس نے گنگنایا ہے
سُنی ہیں میں نے اکثر چھُپ کے نغمہ خوانیاں اُسکی

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہی میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہی گیت گائے ہیں
مری دُنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اُس کی

لبِ لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہی
جبینِ نور افشاں پر نہ جھُومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اُس کا تبسّم اُس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اُسکی

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اُسکی

سنہ ۱۹۳۹ء

مزارِ رہنما

برمزار ڈاکٹر انصاری مرحوم

بنیں اربابِ دل اہلِ نظر بھی!
نہاں ہے سنگ پاروں میں گہر بھی

جمالِ قوم بھی صاحب نظر بھی!
مسافر بھی، خضر بھی چارہ گر بھی

خنک اور مرمریں مدفن میں پنہاں
خروشِ برق و طوفانِ شرر بھی

سکونِ دیر۔ تقدیسِ کلیسا
گدازِ اُمّتِ خیر البشر بھی

یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گزر بھی

۱۹۳۹ء

اِدھر بھی آ

یہ جہد و کش مکش یہ خروشِ جہاں بھی دیکھ
ادبار کی، سروں پہ گھنی بدلیاں بھی دیکھ
یہ توپ یہ تفنگ یہ تیغ و سناں بھی دیکھ
او کشتۂ نگارِ دل آرا اِدھر بھی آ

آ، اور بگل کا نغمۂ "جاں آفریں" بھی سُن
آ، بے کسوں کا نالۂ اندوہگیں بھی سُن
آ، باغیوں کا زمزمۂ آتشیں بھی سُن
او مستِ ساز و بربط و نغمہ اِدھر بھی آ

نقدیر کچھ ہو، کاوشِ تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظر ہے عشرتِ فردا اِدھر بھی آ

سنہ ۱۹۳۹ء

خوابِ سحر

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر
عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا
دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا
اک نہ اک مذہب کی سعیِ خام بھی ہوتی رہی
اہلِ دل پر بارشِ اِلہام بھی ہوتی رہی
آسمانوں سے فرشتے بھی اترتے ہی رہے
نیک بندے بھی خُدا کا کام کرتے ہی رہے

ابنِ مریم بھی اُٹھے موسیٰ عمراں بھی اُٹھے
رام و گوتم بھی اُٹھے، فرعون و ہامان بھی اُٹھے
اہلِ سیف اُٹھتے رہے اہلِ کتاب آتے رہے
ایں جناب اُٹھتے رہے اور آنجناب آتے رہے
حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی
مسجدوں میں مولوی خطبے سُناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے
آدمی منّت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا
اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھِستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکّی میں پِستی ہی رہی
رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی
اہلِ باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے

یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غُلام
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظُلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

۱۹۳۹ء

شکوۂ مختصر

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی اُن زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوقِ رسوا کی پذیرائی
مجھے شکوہ نہیں اُن پاک باطن نکتہ چینوں سے
لبِ معجز نمانے، جن کے مجھ پر آگ برسائی
مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے اُن پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنھوں نے فطرتِ شاعر کو انگڑائی
مجھے شکوہ نہیں دیر و حرم کے آستانوں سے
وہ، جن کے در پہ کی ہے مدتوں میں نے جبیں سائی

مجھے شکوہ نہیں افتادگانِ عیش و عشرت سے
وہ جن کو میرے حالِ زار پر اکثر ہنسی آئی
مجھے شکوہ نہیں اُن صاحبانِ جاہ و ثروت سے
نہیں آئی میرے حصہ میں جن کی ایک بھی پائی
زمانہ کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن، آئینِ فرسُودہ سے شکوہ ہے

۱۹۳۹ء

غزل

وہ نقاب آپ سے اُٹھ جائے تو کچھ دُور نہیں
ورنہ میری نگہِ شوق بھی مجبُور نہیں

خاطرِ اہلِ نظر حُسن کو منظُور نہیں
اس میں کچھ تیری خطا دیدۂ مہجُور نہیں

لاکھ چھپتے ہو مگر چھپ کے بھی مستُور نہیں
تم عجب چیز ہو نزدیک نہیں دور نہیں

جرأتِ عرض پہ وہ کچھ نہیں کہتے لیکن
ہر ادا سے یہ ٹپکتا ہے کہ منظُور نہیں

دل دھڑک اُٹھتا ہی خود اپنی ہی ہر آہٹ پر
اب قدم منزلِ جاناں سی بہت دُور نہیں

ہائے وہ وقت کہ جب بے پیے مدہوشی تھی
ہائے یہ وقت کہ اب پی کے بھی مخمور نہیں

حُسن ہی حُسن ہے جس سمت اٹھاتا ہوں نظر
اب یہاں طُور نہیں، برقِ سرِ طُور نہیں

دیکھ سکتا ہوں جو آنکھوں سے وہ کافی ہے مجازؔ
اہلِ عرفاں کی نوازش مجھے منظُور نہیں

سنہ ۱۹۴۰ء

گُریز

یہ جا کر کوئی بزمِ خوباں میں کہہ دو
کہ اب درخورِ بزمِ خوباں نہیں میں
مبارک تمہیں قصر و ایواں تمہارے
وہ دلدادۂ قصر و ایواں نہیں میں
جوانی بھی سرکش، محبت بھی سرکش
وہ زندانئِ زلفِ پیچاں نہیں میں
تڑپ میری فطرت، تڑپتا ہوں لیکن
وہ زخمیِ پیکانِ مژگاں نہیں میں

دھڑکتا ہے دل اب بھی راتوں کو لیکن
وہ نوحہ گرِ دردِ ہجراں نہیں ہے
بایں تشنہ کامی، بہ ایں تلخ کامی
رہینِ لبِ شکّر افشاں نہیں ہے
شراب و شبستاں کا مارا ہوں لیکن
وہ غرقِ شراب و شبستاں نہیں ہے
قسم نطق کی شعلہ افشانیوں کی
کہ شاعر تو ہوں، اب غزلخواں نہیں ہے

سنہ ۱۹۴۰ء

حُسن و عشق

مجھ سے مت پُوچھ "مرے حُسن میں کیا رکھّا ہی"
آنکھ سے پردۂ ظلمات اُٹھا رکھّا ہی
میری دُنیا کہ مرے غم سے جہنّم بردوش
تُو نے دُنیا کو بھی فردوس بنا رکھّا ہی

مجھ سے مت پُوچھ "ترے عشق میں کیا رکھا ہی"
سوز کو ساز کے پردے میں چھپا رکھّا ہی
جگمگا اُٹھتی ہی دُنیائے تخیئل جس سے
دل میں وہ شعلۂ جانسوز دبا رکھّا ہی

سنہ ۱۹۴۰ء

ایک غم گین یاد!

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فرازِ آسماں پر کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اٹھتی تھی اُسکی چشمِ خنداں میں
خمستانِ فلک سے نُور کی صہبا چھلکتی تھی

مرے بازو پہ جب وہ زُلفِ شبگوں کھول دیتی تھی
زمانہ نکہتِ خُلدِ بریں میں ڈوب جاتا تھا
مرے شانہ پہ جب سر رکھ کے ٹھنڈی سانس لیتی تھی
مری دُنیا میں سوز و ساز کا طُوفان آتا تھا

وہ میرا شعر جب میری ہی لَے میں گنگناتی تھی
مناظر جھومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا
مری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر جب مسکراتی تھی
مرے ظلمت کدے کا ذرّہ ذرّہ جگمگاتا تھا

اُمنڈ آتے تھے جب اشکِ محبّت اسکی پلکوں تک
ٹپکتی تھی در و دیوار سے شوخی تبسم کی
جب اس کے ہونٹ آجاتے تھے از خود میرے ہونٹوں تک
جھپک جاتی تھیں آنکھیں آسماں پر ماہ و انجم کی

وہ جب ہنگامِ رخصت دیکھتی تھی مجھ کو مُڑ مُڑ کر
تو خُود فطرت کے دل میں محشرِ جذبات ہوتا تھا
وہ محوِ خواب جب ہوتی تھی اپنے نرم بستر پر
تو اُس کے سر پہ مریم کا مقدس ہاتھ ہوتا تھا

سنہ ۱۹۴۱ء

غزل

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم
ہٹ کر چلے ہیں رہگذرِ کارواں سے ہم
کیا پوچھتے ہو جھومتے آئے کہاں سے ہم
پی کر اٹھے ہیں خمکدۂ آسماں سے ہم
یوں کر ہوا ہے فاش زمانہ پہ کیا کہیں
وہ رازِ دل جو کہہ نہ سکے رازداں سے ہم
ہمدم یہی ہے رہگذرِ یارِ خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے
الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

ہر نرگسِ جمیل نے مخمور کر دیا
پی کر اُٹھے شراب ہر اک بوستاں سے ہم

ٹھکرا دیئے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کشمکشِ امتحاں سے ہم

دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طرازِ شوق
لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم

بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جراَتیں مجاؔز
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

۱۹۴۱ء

شہرِ نگار

رخصت اے ہم سفرو شہرِ نگار آ ہی گیا
خُلد بھی جس پہ ہو قرباں وہ دیار آ ہی گیا

یہ جنوں زار مرا، میرے غزالوں کا جہاں
میرا نجد آ ہی گیا، میرا تتار آ ہی گیا

آج پھرتا ہے چمن در پئے گلہائے چمن
گنگناتا ہوا زنبورِ بہار آ ہی گیا

گیسوؤں والوں میں، ابرو کے کمانداروں میں
ایک صید آ ہی گیا، ایک شکار آ ہی گیا

باغبانوں کو بتاؤ، گُل و نسریں سے کہو
اک خرابِ گل و نسرینِ بہار آ ہی گیا

خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگامِ سحر!
اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آ ہی گیا

زُلف کا ابرِ سیہ بازوئے سیمیں پہ لئے
پھر کوئی زخمہ زنِ سازِ بہار آ ہی گیا

ہوگئی تشنہ لبی آج رہینِ کوثر
میرے لب پر لبِ لعلینِ نگار آ ہی گیا

سنہ ۱۹۴۲ء

آہنگ نو

اے جوانانِ وطن رُوح جواں ہے تو اُٹھو
آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اُٹھو
خوفِ بے حُرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اُٹھو
پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اُٹھو

اُٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اُٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اُٹھ کر

ایک اک سمت سے شبخون کی تیاری ہے
لطف کا وعدہ ہے اور مشقِ جفا کاری ہے
محفلِ زیست پہ فرمانِ قضا جاری ہے
شہر تو شہر ہے گاؤں پہ بھی بم باری ہے

یہ فضا میں جو گرجتے ہوئے طیّارے ہیں
بر سرِ دوشِ ہوا موت کے ہرکارے ہیں

اُس طرف ہاتھوں میں شمشیریں ہی شمشیریں ہیں
اِس طرف ذہن میں تدبیریں ہی تدبیریں ہیں
ظلم پر ظلم ہیں تعزیروں پہ تعزیریں ہیں
سر پہ تلوار ہے اور پاؤں میں زنجیریں ہیں

ایک ہو ایک کہ ہنگامۂ محشر ہے یہی!
عرصۂ زیست کا ہنگامۂ اکبر ہے یہی!

اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں
شعلہ افشاں و شرر بار چلے آتے ہیں
خون پیتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں
تم جو اُٹھ جاؤ تو بیکار چلے آتے ہیں

خُون جو بہہ نکلا ہے اُس خُون میں بہا دو انکو
اُن کی کھودی ہوئی خندق میں گرا دو اِن کو

رنگِ گلہائے گلستانِ وطن تم سے ہے
شورشِ نعرۂ رندانِ وطن تم سے ہے

نشۂ نرگسِ خوبانِ وطن تم سے ہے
عفّتِ ماہ جبینانِ وطن تم سے ہے

تم ہو غیرت کے امیں تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں احساس نہیں ہے کہ نہیں

یہ درندے یہ شرافت کے پرانے دشمن
تم کہ ہو حاملِ آداب و روایاتِ کُہن
جادہ پیما کے لئے خضر ہو تم یہ رہزن
تم ہو خرمن کے نگہبان یہ برقِ خرمن

خطّۂ پاک میں زنہار نہ آنے پائیں!
آ ہی جائیں جو یہ زندہ تو نہ جانے پائیں!

مرد و زن پیر و جواں اِن کے مظالم کے شکار
خُونِ معصوم میں ڈوبی ہوئی اِن کی تلوار
یہ قیامت کے ہوسناک غضب کے خوں خوار
اِن کے عصیاں کی نہ حد ہے نہ جرائم کا شمار

یہ ترحم سے نہ دیکھیں گے کسی کی جانب
اِن کی توپوں کے دہن کردو اِنہی کی جانب

یہ تو ہیں فتنۂ بیدار دبا دو اِن کو!
یہ مٹا دیں گے تمدّن کو مٹا دو اِن کو!
پھُونک دو اِن کو جھُلس دو کہ جلادو اِن کو
شانِ شایانِ وطن ہو یہ بنا دو اِن کو

یاد ہے تم کو کنِ اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسر بھیم کی اولادیں ہو

تم تو تنہا بھی نہیں ہو کئی دم ساز بھی ہیں
رُوس کے مرد بھی ہیں چین کے جانباز بھی ہیں
کچھ نہ کچھ ساتھ فرنگیٔ فسوں ساز بھی ہیں
اور ہم جیسے بہت زمزمہ پرداز بھی ہیں

دُور انسان کے سر سے یہ مُصیبت کردو
آگ دوزخ کی بُجھا دو اسے جنّت کردو

۱۹۴۲ء

غزل

مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں

یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں!
سبھی ہے حُسن، مگر عشق کا جواب نہیں!

مری نگاہ میں جلوے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں

جنوں بھی حد سے سوا شوق بھی ہی حد سی سوا
یہ بات کیا ہے کہ میں موردِ عتاب نہیں

یہاں تو حُسن کا دل بھی ہے غم سے صد پارہ
میں کامیاب نہیں وہ بھی کامیاب نہیں

یہاں تو رات کی بیداریاں مُسلّم ہیں
مگر وہاں بھی حسیں انکھڑیوں میں خواب نہیں

نہ پوچھئے مری دنیا کو میری دنیا میں
خود آفتاب بھی ذرّہ ہے آفتاب نہیں

سب ہی ہیں میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے کوئی خراب نہیں

مجازؔ کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیابِ محبّت بھی کامیاب نہیں

سنہ ۱۹۴۳ء

عشرتِ تنہائی

ہیں کہ میخانۂ اُلفت کا پُرانا میخوار!
محفلِ حُسن کا اک مُطربِ شیریں گفتار!
ماہ پاروں کا ہدف، زہرہ جبینوں کا شکار
نغمہ پیرا و نوا سنج و غزلخواں ہوں میں

کتنے دل کش مرے تبخانۂ ایماں کے صنم
وہ کلیساؤں کے آہو، وہ غزالانِ حرم
میں ہمہ شوق و محبّت، وہ ہمہ لطف و کرم
مرکزِ مرحمتِ محفلِ خوباں ہوں میں

موجزن ہے مئے عشرت مرے پیمانوں میں
یاس کا درد ہے کمتر مرے افسانوں میں
کامرانی ہے پر افشاں مرے رُومانوں میں
یاس کی سعیِ جنوں خیز پہ خنداں ہوں میں

میرے افکار میں مہتاب کی طلعت غلطاں
میری گفتار میں ہی صبح کی نزہت غلطاں
میرے اشعار میں ہی پھولوں کی نکہت غلطاں
رُوحِ گلزار ہوں میں جانِ گلستاں ہوں میں

لاکھ مجبور ہوں میں ذوقِ خود آرائی سے
دل ہے بیزار اب اس عشرتِ تنہائی سے
آنکھ مجبور نہیں ہے مری بینائی سے
محرمِ درد و غمِ عالمِ انساں ہوں میں

کیوں نہ چاہوں کہ ہر اک ہاتھ میں پیمانہ ہو
یاس و محرومی و مجبوری اک افسانہ ہو
عام اب فیضِ مئے و ساقی و مے خانہ ہو
رند ہوں اور جگر گوشۂ رنداں ہوں میں

اب یہ ارماں کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور

اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

۱۹۴۳ء

عیادت

یہ کون آگیا رُخِ خنداں لیئے ہوئے
عارض پہ رنگ و نُور کا طوفاں لیئے ہوئے
بیمار کے قریب بصد شانِ اِحتیاط!
دلداریٔ نسیمِ بہاراں لیئے ہوئے
رُخسار پر لطیف سی اِک موجِ سرخوشی
لب پر ہنسی کا نرم سا طوفاں لیئے ہوئے
پیشانیٔ جمیل پہ انوارِ تمکنت
تابندگیٔ صبحِ درخشاں لیئے ہوئے
زلفوں کے پیچ و خم میں بہاریں چھپی ہوئی
اک کاروانِ نکہتِ بستاں لیئے ہوئے

آ ہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز!
ظلمت کدے میں شمع فروزاں لیے ہوئے

اک اک ادا میں سینکڑوں پہلوئے دلدہی
اک اک نظر میں پرسشِ پنہاں لیے ہوئے

میرے سوادِ شوق کا خورشیدِ نیم شب
عزمِ شکستِ ماہ جبیناں لیے ہوئے

درسِ سکون و صبر بہ ایں اہتمامِ ناز
نشتر زنیٔ جنبشِ مژگاں لیے ہوئے

آنکھوں سے ایک رَو سی نکلتی ہوئی ہر آن
غرقابیٔ حیات کا ساماں لیے ہوئے

ملتی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی
کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لیے ہوئے

یہ کون ہے مجازؔ سے سرگرمِ گفتگو
دونوں ہتھیلیوں پہ زنخداں لیے ہوئے

۱۹۴۴ء

مادام

زُلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لیٔے
لب پہ افسوں لیٔے آنکھوں میں مئے ناب لیٔے
ہر نفس رُو میں لیٔے شورشِ طغیانِ نہاں
ہر نظر شوق کا افسانۂ بے تاب لیٔے
سحر و اعجاز لیٔے جنبشِ مژگانِ دراز
خندۂ شوخ جمالِ دُرِ خوش آب لیٔے
ضو فگن روئے حسیں پُر شبِ مہتاب شباب
چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لیٔے
نشۂ نازِ جوانی میں سرشار ادا
جسم ذوقِ گہرا طلس و کمخواب لیٔے

زلفِ شبرنگ لئے صندل و عود و عنبر
خمِ ابروئے حسیں دیر کی محراب لئے
لبِ گلرنگ و حسیں، جسم گداز و سیمیں
شوخیٔ برق لئے لرزشِ سیماب لئے
ایک صیّاد خوش اندام سوادِ مشرق
زلفِ بنگال لئے، طلعت پنجاب لئے
نزہت و ناز کا اک پیکرِ شاداب و حسیں
نکہت و نُور کا اُمڈا ہوا سیلاب لئے
میری وارفتگیٔ شوق مسلّم، لیکن
کس کی آنکھیں ہیں زُلیخا کا حسیں خواب لئے

سنہ ۱۹۴۴ء

غزل

نہ ہم آہنگِ مسیحا، نہ حریفِ جبریل
تیرا شاعر کہ ہے زندانیِ گیسوئے جمیل

کِسکی آنکھوں میں یہ غلطاں ہے جوانی کی شراب
کھولدی آہ یہ کس نے مئے گلگوں کی سبیل

کس طرف جائے کہاں جائے بتا دو کوئی
زلفِ پُرخم کا گرفتار نگاہوں کا قتیل

عالمِ یاس میں کیا چیز ہے اک ساغرِ مے
دشتِ ظلمات میں جسطرح خضر کی قندیل

کتنی دشوار ہے پیرانِ حرم کی منزل
اس طرف فتنۂ ابلیس اُدھر ربِّ جلیل

اُف یہ طوفانِ نشاط اور مری طبع حزیں
آہ یہ یورشِ ناز اور میں مجروح و علیل

آہ وہ ہوش کا عالم وہ غموں کا طوفاں
اُف یہ مستی کہ ہے پھر ہوش میں آنیکی دلیل

سنہ ۱۹۴۴ء

آج بھی

میں ہوں مجازؔ آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں!
شاعرِ محفلِ وفا، مُطربِ بزمِ دلبراں!
آج بھی خار زارِ غم خلدِ بریں مرے لئے
آج بھی رہ گذارِ عشق میرے لئے ہے کہکشاں
آج بھی گا رہا ہوں میں سازِ جنوں لئے ہوئے
سوزِ نہاں سے آج بھی رُوح تپاں ہے دل تپاں
آج بھی زندگی مری غرقِ شرابِ تندو تیز
آج بھی ہاتھ میں مرے جامِ شرابِ ارغواں
آج بھی ہے رچی ہوئی آج بھی ہے بسی ہوئی
میرے نفس میں خُلد کی نزہت و نکہتِ جواں

آج بھی نکتہ چیں ہوں ہیں خلوتیانِ خاص کا
خلوتیانِ خاص کا آج بھی ہوں مزاج داں
آج بھی اشکِ خوں مرا قشقۂ جبینِ ناز کا
آج بھی خاکِ دل مری سُرمۂ چشمِ گل رخاں
آج بھی ہے زباں مری خنجرِ بے نیامِ شوق
بحث طلب ہے آج بھی جرأت و شوخیٔ بیاں
آج بھی دل کو ہے مرے دولتِ آگہی نصیب
آج بھی ہے نظر مری ارض و سما کی رازداں
آج بھی ہے جنوں مرا دیر و حرم پہ خندہ زن
آج بھی مجھ سے بدحواس دیر و حرم کے پاسباں
آج بھی سازسے مرے گرمیٔ بزمِ سرکشی
آج بھی آتشِ سخن شعلہ فشاں شرر فشاں
آج بھی ہے لکھی ہوئی سُرخ حروف میں مجازؔ
دفترِ شہریار میں میرے جنوں کی داستاں

۱۹۴۴ء

غزل

عقل کی سطح سے کچھ اور اُبھر جانا تھا
عشق کو منزلِ پستی سے گذر جانا تھا

جلوے تھے حلقۂ ہر دامِ نظر سے باہر
میں نے ہر جلوے کو پابندِ نظر جانا تھا

حُسن کا غم بھی حسیں، فکر حسیں، درد حسیں
اُن کو ہر رنگ میں ہر طور سنور جانا تھا

حُسن نے شوق کے ہنگامے تو دیکھے تھے بہت
عشق کے دعوئے تقدیس سے ڈر جانا تھا

یہ تو کیا کہیے چلا تھا میں کہاں سے ہمدم
مجھکو یہ بھی نہ تھا معلوم کدھر جانا تھا

حُسن اور عشق کو دے طعنۂ بیداد مجازؔ
تم کو تو صرف اسی بات پہ مر جانا تھا

۱۹۴۵ء

لکھنؤ

فردوسِ حسن و عشق ہی داماںِ لکھنؤ
آنکھوں میں بس رہی ہیں غزالانِ لکھنؤ

صبر آزما ہی غمزۂ ترکانِ لکھنؤ
رشکِ زنانِ مصر کنیزانِ لکھنؤ

ہر سمت اک ہجومِ نگارانِ لکھنؤ
اور ہیں کہ ایک شوخ غزلخوانِ لکھنؤ

مطرب بھی ہی شراب بھی ابرِ بہار بھی
شیراز بن گیا ہی شبستانِ لکھنؤ

تولے ہوئی ہی تیغ و سناں حسنِ بے نقاب
ناوک فگن ہی جلوۂ پنہانِ لکھنؤ

"اک نو بہارِ ناز کو تاکی ہے پھر نگاہ"
وہ نو بہارِ ناز کہ ہے جانِ لکھنؤ

دستِ جنوں کو روکئے یہ خبط چھوڑیئے
رسوا ہی یونہی چاکِ گریبانِ لکھنؤ

کچھ روز کا مسافر و مہماں ہوں اور کیا
کیوں بدگماں ہوں یوسفِ کنعانِ لکھنؤ

اب اس کے بعد صبح ہی اور صبحِ نو مجازؔ
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

سنہ ۱۹۴۵ء

مجھے جانا ہے اِک دن!

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر
ابھی پھر درد ٹپکے گا مری آواز سے آخر
ابھی پھر آگ اٹھے گی شکستہ ساز سے آخر
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو حُسن کے پیروں پہ ہے جبرِ حنا بندی
ابھی ہے عشق پر آیئنِ فرسُودہ کی پابندی
ابھی حاوی ہے عقل و رُوح پر جُھوٹی خداوندی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تہذیب عدل و حق کی کشتی کھے نہیں سکتی!
ابھی یہ زندگی دادِ صداقت دے نہیں سکتی!
ابھی انسانیت دولت سے ٹکّر لے نہیں سکتی!
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو کائنات اوہام کا اک کارخانہ ہے
ابھی دھوکا حقیقت ہے، حقیقت اک فسانہ ہے
ابھی تو زندگی کو زندگی کرکے دکھانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی ہیں شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری
ابھی ہے اک حسیں تحریکِ طوفاں منتظر میری
ابھی شاید ہے اک زنجیرِ زنداں منتظر میری
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو فاقہ کش انسان سے آنکھیں ملانا ہے
ابھی جھلسے ہوئے چہروں پہ اشکِ خوں بہانا ہے
ابھی پامالِ جورِ آدم کو سینے سے لگانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی ہر دشمنِ نظمِ کہن کے گیت گانا ہے
ابھی ہر لشکرِ ظلمت شکن کے گیت گانا ہے
ابھی خود سر فروشانِ وطن کے گیت گانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

کوئی دم میں حیاتِ نو کا پھر پرچم اٹھاتا ہوں
بایمائے حمیّت جان کی بازی لگاتا ہوں
میں جاؤں گا میں جاؤں گا میں جاتا ہوں میں جاتا ہوں
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

۱۹۴۵ء

غزل

سازگار ہے ہمدم ان دنوں جہاں اپنا
عشق شادماں اپنا شوق کامراں اپنا

آہ بے اثر کس کی نالۂ نارسا کس کا
کام بارہا آیا جذبۂ نہاں اپنا

کب کیا تھا اس دل پر حُسن نے کرم اتنا
مہرباں اور اس درجہ کب تھا آسماں اپنا

اُلجھنوں سی گھبرائے میکدے میں در آئے
کس قدر تن آساں ہے ذوقِ رائیگاں اپنا

کچھ نہ پوچھ اے ہمدم اِن دنوں مرا عالم
مُضطرب حسیں اپنا ساقیِ جواں اپنا

عشق اور رسوائی کون سی نئی شے ہے
عشق تو ازل سے تھا رسوائے جہاں اپنا

تم مجاز دیوانے مصلحت سے بیگانے
ورنہ ہم بنا لیتے تم کو رازداں اپنا

سنہ ۱۹۴۵ء

شرارے

خود کو بہلانا تھا آخر خود کو بہلاتا رہا
میں بہ ایں سوزِ دروں ہنستا رہا گاتا رہا

مجکو احساسِ فریبِ رنگ و بُو ہوتا رہا
میں مگر پھر بھی فریبِ رنگ و بُو کھاتا رہا

مری دنیائے وفا میں کیا سی کیا ہونے لگا
اک دریچہ بند مجھ پر ایک وا ہونے لگا

اِک نگارِ ناز کی پھرنے لگیں آنکھیں مجاز
اِک بُتِ کافر کا دل دردآشنا ہونے لگا

عین ہنگامِ طرب رُوحِ طرب تھرا گئی
دفعتاً دل کے افق پر اک گھٹا سی چھا گئی
ایک آغوشِ تمنّا کا تقاضا دیکھ کر
ایک دل کی سرد مہری بھی مجھے یاد آگئی

مجرمِ سرتابیِ حسنِ جواں ہو جایئے
گلفشانی تا کجا، شعلہ فشاں ہو جایئے
کھائیگا اک نگاہِ لطف کا کبتک فریب
کوئی افسانہ بنا کر بدگماں ہو جایئے

۱۹۴۵ء

غزل

ساقیٔ گلفام باصد اہتمام آہی گیا
نغمہ بر لب، خم بہ سر، بادہ بجام آہی گیا

اپنی نظروں میں نشاطِ جلوۂ خوباں لئے
خلوتیٔ خاص سوئے بزمِ عام آہی گیا

میری دنیا جگمگا اٹھی کسی کے نور سے
میرے گردوں پر مرا ماہِ تمام آہی گیا

جھوم جھوم اُٹھے شجر کلیوں نے آنکھیں کھولدیں
جانبِ گلشن کوئی مستِ خرام آہی گیا

پھر کسی کے سامنے چشمِ تمنّا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگِ احترام آ ہی گیا

میری شب اب میری شب ہے، میرا بادہ میرے جام
وہ مرا سروِ رواں ماہِ تمام آ ہی گیا

بارہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی
بارہا مستی میں لب پر اُن کا نام آ ہی گیا

زندگی کے خاکۂ سادہ کو رنگیں کر دیا
حسن کام آئے نہ آئے عشق کام آ ہی گیا

کُھل گئی تھی صاف گردونکی حقیقت ای مجازؔ
خیریت گذری کہ شاہیں زیرِ دام آ ہی گیا

۱۹۴۵ء

اعتراف

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو؟
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں رُوحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو، فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے
خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے

شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خوابگاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے

حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے

ان دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاریٔ عشرت کا جنوں طاری تھا

ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہر یاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا

بسترِ مخمل و سنجاب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسیں خواب تھی دنیا میری

جنتِ شوق تھی بیگانۂ آفاتِ سموم
درد جب درد نہ ہو، کاوشِ درماں معلوم

خاک تھے دیدۂ بیباک میں گردوں کے نجوم
بزمِ پرویں تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ہجوم

لیلیٔ ناز برافگندہ نقاب آتی تھی
اپنی آنکھوں میں لئے دعوتِ خواب آتی تھی

سنگ کو گوہرِ نایاب و گراں جانا تھا
دشتِ پُرخار کو فردوسِ جواں جانا تھا
ریگ کو سلسلۂ آبِ رواں جانا تھا
آہ یہ رازِ ابھی میں نے کہاں جانا تھا

میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے رازِ غم و حسرت پنہاں

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریادِ جگردوز، مرا نالۂ زار
شدتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو

اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں
اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو؟

۱۹۴۵ء

غزل

شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حُسن بھی کیا رسوا ہوگا
حُسن کی بزمِ خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا
چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا ہوگا
درد کہ اپنی آپ دوا ہے تم سے کیا اچھا ہوگا
واعظِ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں
اس دنیا میں کیا رکھا ہے اس دنیا میں کیا ہوگا
تم بھی مجازؔ انسان ہو آخر لاکھ چھُپاؤ عشق اپنا
یہ بھید مگر کھُل جائے گا یہ راز مگر افشا ہوگا

١٩٣٥ء

غزل

آسماں تک جو نالہ پہنچا ہے
دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے

میری نظروں میں حشر بھی کیا ہے
میں نے ان کا جلال دیکھا ہے

جلوۂ طور خوابِ موسیٰ ہے
کس نے دیکھا ہے کس کو دیکھا ہے

ہائے انجام اس سفینے کا
ناخُدا نے جسے ڈبویا ہے

آہ کیا دل میں اب لہو بھی نہیں
آج اشکوں کا رنگ پھیکا ہے

جب بھی آنکھیں ملیں اُن آنکھوں سے
دل نے دل کا مزاج پوچھا ہے

وہ جوانی کہ تھی حریفِ طرب
آج بربادِ جام و صہبا ہے

کون اُٹھ کر چلا مقابل سے
جس طرف دیکھیے اندھیرا ہے

پھر مری آنکھ ہو گئی نمناک
پھر کسی نے مزاج پُوچھا ہے

سچ تو یہ ہے مجازؔ کی دُنیا
حُسن اور عشق کے سوا کیا ہے

۱۹۴۵ء

الہ آباد سے

بتاریخ ۲ر فروری ۱۹۴۵ء جس دن سنگم کی رومان خیز سرزمین پر جشنِ سالگرہ لکھنے والے شاعر کی سال گرہ منائی گئی۔

الہ آباد میں ہر سُو ہیں چرچے
کہ "دلّی کا شرابی" آ گیا ہے

بہ صد آوارگی، با صد تباہی
بہ صد خانہ خرابی آ گیا ہے

گلابی لاؤ، چھلکاؤ، لنڈھاؤ
کہ شیدائے گلابی آ گیا ہے

نگاہوں میں خمارِ بادہ لے کر
نگاہوں کا شرابی آ گیا ہے

وہ سرکش، رہزنِ ایوانِ خوباں
بہ عزمِ باریابی آ گیا ہے

وہ رسوائے جہاں، ناکامِ دوراں
بہ زعمِ کامیابی آ گیا ہے

بتانِ نازفرما سے یہ کہہ دو
کہ اک تُرکِ شہابی آ گیا ہے

نواسنجانِ سنگم کو بتا دو
حریفِ فاریابی آ گیا ہے

یہاں کے شہریاروں کو خبر دو
کہ مردِ انقلابی آ گیا ہے

۱۹۴۵ء

بول! اری او دھرتی بول!

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانوا ڈول

بادل بجلی رین اندھیاری   دکھ کی ماری پرجا ساری
بوڑھے بچے سب دکھیا ہیں   دکھیا نر ہیں دکھیا ناری
بستی بستی لوٹ مچی ہے   سب بنئے ہیں سب بیوپاری

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانوا ڈول

کلجگ ہیں جگ کے رکھوالے
چاندی والے سونے والے
دیسی ہوں یا پردیسی ہوں
نیلے پیلے گورے کالے
مکھّی بھنگے بھن بھن کرتے
ڈھونڈے ہیں مکڑی کے جالے

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانواڈول

کیا افرنگی کیا تاتاری
آنکھ بچی اور برچھی ماری
کب تک جنتا کی بے چینی
کب تک جنتا کی بے زاری
کب تک سرمایہ کے دھندے
کب تک یہ سرمایہ داری

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانواڈول

نامی اور مشہور نہیں ہم
لیکن کیا مزدور نہیں ہم
دھوکہ اور مزدوروں کو دیں
ایسے تو مجبور نہیں ہم
منزل اپنے پاؤں کے نیچے
منزل سے اب دور نہیں ہم

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانواڈول

بول کہ تیری خدمت کی ہے
بول کہ تیرا کام کیا ہے

بول کہ تیرے پھل کھائے ہیں   بول کہ تیرا دُودھ پیا ہے

بول کہ ہم نے حشر اُٹھایا   بول کہ ہم سے حشر اُٹھا ہے

بول کہ ہم سے جاگی دُنیا

بول کہ ہم سے جاگی دھرتی

بول! اری او دھرتی بول!

راج سنگھاسن ڈانوا ڈول

سنہ ۱۹۴۵ء

مہمان

آج کی رات اور باقی ہے

کل تو جانا ہی ہے سفر پہ مجھے
زندگی منتظر ہے مُنہ پھاڑے
زندگی، خاک و خوں میں لتھڑی
آنکھ میں شعلہ ہائے تُند لئے

دو گھڑی خود کو شادماں کرلیں
آج کی رات اور باقی ہے

چلنے ہی کو ہے اک سموم ابھی
رقص فرما ہے رُوحِ بربادی
بربریت کے کاروانوں سے
زلزلے میں ہے سینۂ گیتی

ذوقِ پنہاں کو کامراں کرلیں
آج کی رات اور باقی ہے

ایک پیمانۂ مے سرجوش
لطفِ گفتار گرمئ آغوش
بوسے ــــ اس درجہ آتشیں بوسے
پھونک ڈالیں جو میری کشتِ ہوش

رُوحِ یخ بستہ ہی تپاں کرلیں
آج کی رات اور باقی ہے

ایک دو اور ساغرِ سرشار
پھر تو ہونا ہی ہے مجھے ہشیار
چھیڑنا ہی ہے سازِ زیست مجھے
آگ برسائیں گے لبِ گفتار

کچھ طبیعت تو ہم رواں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

پھر کہاں یہ حسیں سہانی رات
یہ فراغت، یہ کیف کے لمحات
کچھ تو آسودگیٔ ذوقِ نہاں
کچھ تو تسکینِ شورشِ جذبات

آج کی رات جاوداں کر لیں
آج کی رات، اور آج کی رات

سنہ ۱۹۴۵ء

آج

کارفرما پھر مرا ذوقِ غزلخوانی ہے آج
پھر نفس کا سازگرمِ شعلہ افشانی ہے آج

پھر نگاہِ شوق کی گرمی ہی اور رُوئے نگار
پھر عرق آلُود اک کافر کی پیشانی ہے آج

پھر مرے لب پر قصیدے ہیں لبِ ورخسار کے
پھر کسی چہرے پہ تابانی سی تابانی ہے آج

حُسن اس درجہ نشاطِ حُسن میں ڈُوبا ہوا
انکھڑیاں بےخود شمیمِ زلف دیوانی ہے آج

لرزشِ لب میں شراب وشعر کا طوفان ہے
جنبشِ مژگاں میں افسونِ غزلخوانی ہے آج

وہ نفس کی زمزمہ سنجی نظر کی گفتگو
سینۂ معصوم میں اک طرفہ طغیانی ہے آج

یاں بہ ایں عالم غرورِ یوسفیت بھی نہیں
واں زلیخائی بہ عزمِ چاک دامانی ہے آج

واں اشارے ہیں بہک جانا ہی عینِ ہوش ہے
ہوش میں رہنا یقیناً سخت نادانی ہے آج

کش مکش سی کش مکش ہیں یہ ہے مذاقِ عاشقی
کامراں سی کامراں ہر سعیِ امکانی ہے آج

حُسن کے چہرے پہ ہے نُورِ صداقت کی دمک
عشق کے سر پر کلاہِ فخرِ انسانی ہے آج

شوق سے موقع شناسی کی توقع بھی غلط
میں نے اُن کی شکل بھی مشکل سے پہچانی ہے آج

۱۹۴۵ء

بُتانِ حرم

کیا کہوں میں رات کس محفل میں تھا گرمِ نوا
نغمہ و نکہت کا وہ طوفان وہ ٹھنڈی ہوا

دیدنی تھا نازنینانِ تمدّن کا ہجوم
بے حقیقت تھے نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم

ناز پروردہ جبیں، افکارِ غم سے بے نیاز
مہ جبینانِ حرم قیدِ حرم سے بے نیاز

جن کی اک جنبش سے بنیادِ حرم میں ارتعاش
جن کی اک ٹھوکر سے زنجیرِ قدامت پاش پاش

بن گیا تھا یک بیک فردوسِ کیف و انبساط
ایک دیرینہ کرم فرما کا ایوانِ نشاط

نرم صوفے گود میں فردوسِ رعنائی لئے
زلف کے خم، مرمریں شانوں کی برنائی لئے

وہ حسین پیشانیاں آئینۂ تمکینِ ناز
وہ رسیلی مدھ بھری آنکھیں وہ مژگانِ دراز

وہ سبک چاندی سے پیکر وہ جوانی کا نکھار
آذرِ فطرت کی صنّاعی کے زندہ شاہکار

رُخ پہ شادابی، لبوں میں رس، تبسم برق پاش
چُست پیراہن، نمایاں جسمِ سیمیں کی تراش

شوخ آنکھیں بادۂ گلگوں کے پیمانے لئے
گیسوئے شب رنگ پیچ و خم میں افسانے لئے

آہ وہ حُسنِ مقابل وہ جمالِ ہم نشیں
دامنِ موجِ ہوا میں اک بہشتِ عنبریں

اک طرف سحرِ ملاحت، اک طرف افسونِ ناز
اک طرف زُلفِ بریدہ، اک طرف زُلفِ دراز

آنچلوں کی سرسراہٹ، زمزمے گاتی ہوئی
پیرہن سے نکہتِ خُلدِ بریں آتی ہوئی

آہ وہ دوشیزہ لب، گلریز لب، گلنار لب

آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب

وہ حجاب آگیں تکلم، وہ رسیلے قہقہے!

وہ نشاط آگیں تبسّم، وہ سُریلے قہقہے

قہقہے جن میں صبا کا راگ سیّاروں کے گیت

نقرئی نے کی صدا جنّت کے مہ پاروں کے گیت

جامِ زرّیں کی کھنک سی قلقلِ مینا کے ساتھ

قدسیوں کی نے سرودِ بربطِ زہرا کے ساتھ

شوخیِ لبِ ناز فرما خندۂ بے باک پر

نور و موسیقی کی اک بارش سی فرشِ خاک پر

گفتگو کچھ اس سلیقے سے کچھ اِس انداز سے

دل بچانا سخت مشکل تھا کمندِ ناز سے

وہ لچک سی جسمِ نازک میں خود اپنے بار سے

پھوٹ نکلیں تھیں شعاعیں عارض و رخسار سے

وہ سمٹنے کی ادا طوفانِ رعنائی کے ساتھ!

ذوقِ خود بینی مذاقِ بزم آرائی کے ساتھ

عارضوں پر اک گلابی پن سا ماتھوں پر دمک
انکھڑیوں میں اک سرورِ فتح مندی کی جھلک

بام و در پر اک تبسّم سا ، فضا گلرنگ تھی!
جنبشِ مژگاں دھڑکتے دل سے ہم آہنگ تھی

میرا نغمہ باعثِ دلدارئ خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہِ نشاطِ جاں تو ہے

۱۹۴۶ء

پہلا جشنِ آزادی

بہ صد غرور بصد فخر و نازِ آزادی
مچل کے کھُل گئی زلفِ درازِ آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طرازِ آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح سازِ آزادی
زمانہ رقص میں ہے زندگی غزلخواں ہے

ہر اک جبیں پہ ہے اک موجِ نورِ آزادی
ہر ایک آنکھ میں کیف و سرورِ آزادی
غلامی خاک بسر ہے حضورِ آزادی
ہر ایک قصر ہے اک بامِ طورِ آزادی
ہر ایک بام پہ اک پرچمِ زر افشاں ہے

ہر ایک سمت نگارانِ یاسمیں پیکر
نکل پڑے ہیں در و بام سے مہ و اختر
وہ سیلِ نور ہے، خیرہ ہے آدمی کی نظر
بصد غرور و ادا خندہ زن ہو گردوں پر
زمینِ ہند کہ جولانگہِ غزالاں ہے

صدا دو انجمِ افلاک رقص فرمائیں
بتانِ کافر و سفاک رقص فرمائیں
شریکِ حلقہ ادراک رقص فرمائیں
طرب کا وقت ہے بے باک رقص فرمائیں
کہ یہ بہار پیامِ صد بہاراں ہے

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں
یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں
ابھی وہ سعیِ جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں، آغازِ کارِ مرداں ہے

سنہ ۱۹۴۷ء

غزل

نہیں یہ فکر کوئی رہبرِ کامل نہیں ملتا
کوئی دنیا میں مانوسِ مزاجِ دل نہیں ملتا

کبھی ساحل پہ رہکر شوق، طوفانوں سے ٹکرائیں
کبھی طوفاں میں رہکر فکر ہی ساحل نہیں ملتا

یہ آنا کوئی آنا ہی کہ بس رسماً چلے آئے
یہ ملنا خاک ملنا ہی کہ دل سے دل نہیں ملتا

شکستہ پا کو مژدہ، خستگانِ راہ کو مژدہ
کہ رہبر کو سراغِ جادۂ منزل نہیں ملتا

وہاں کتنوں کو تخت و تاج کا ارماں ہے کیا کہیے
جہاں سائل کو اکثر کاسۂ سائل نہیں ملتا

یہ قتلِ عام اور بے اذنِ قتلِ عام کیا کہیے
یہ بسمل کیسے بسمل ہیں جنہیں قاتل نہیں ملتا

۱۹۴۸ء

وطن آشوب

سبزہ و برگ و لالہ و سرو و سمن کو کیا ہوا
سارا چمن اداس ہے ہائے چمن کو کیا ہوا

اک سکوت ہر طرف ہوش ربا و ہولناک
خُلدِ وطن کے پاسباں خُلدِ وطن کو کیا ہوا

رقصِ طرب کدھر گیا، نغمہ طراز کیا ہوئے
غمزہ و ناز کیا ہوئے عشوہ و فن کو کیا ہوا

جس کی نوائے دلستاں زخمہ سازِ شوق تھی
کوئی بتاؤ اُس بُتِ غنچہ دہن کو کیا ہوا

چشمکِ دم بدم نہیں مشقِ خرام و رم نہیں
میرے غزال کیا ہوئے، میرے ختن کو کیا ہوا

چھائی ہے کیوں فسردگی عالمِ حسن وعشق پر
آج وہ تن کدھر گئے آج دمن کو کیا ہوا

آنکھوں میں خوف ویاس ہے چہرہ اداس ہے
عصرِ رواں کی لیلئ برقعہ فگن کو کیا ہوا

آہ خرد کدھر گئی، آہ جنوں نے کیا کیا؟
آہ شبابِ خوگرِ دار ورسن کو کیا ہوا

کوئی بتائے عظمتِ خاکِ وطن کہاں ہے اب
کوئی بتائے غیرتِ اہلِ وطن کو کیا ہوا

کوہ وہی دمن وہی دشت وہی چمن وہی
پھر یہ مجازؔ جذبۂ حُبِّ وطن کو کیا ہوا

سنہ ۱۹۵۰ء

فکر

نہیں ہر چند کسی گمشدہ جنّت کی تلاش
اک نہ اک خلدِ طربناک کا ارماں ہے ضرور
بزمِ دوشینہ کی حسرت تو نہیں ہے مجکو
میری نظروں میں کوئی اور شبستاں ہے ضرور
مٹ گئے، برباد جہاں ہو کے سبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کار فرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دلِ مضطر ابھی آماجگہِ یاس نہیں!

تازہ دم بھی ہوں، مگر پھر یہ تقاضا کیوں ہے
ہاتھ رکھ دے مرے ماتھے پہ کوئی زہرہ جبیں

ایک آغوشِ حسیں شوق کی معراج ہے کیا
کیا یہی ہے اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

مہوشوں کا طرب انگیز تبسّم کیا ہے
ہے تو سب کچھ یہ مگر خواب اثر کیوں ہو جائے

حُسن کی جلوہ گہِ ناز کا افسوں تسلیم
یہی قربانگہِ اربابِ نظر کیوں ہو جائے

میں نے سوچا تھا کہ دشوار ہے منزل اپنی
اک حسیں بازوئے سیمیں کا سہارا بھی تو ہو

دشتِ ظلمات سے آخر کو گذرنا ہے مجھے
کوئی رخشندہ و تابندہ ستارا بھی تو ہو

آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا
جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی

ٹوٹ جانا درِ زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی رفیقِ مہِ کنعاں نہ بنی

بہ ایں انعامِ وفا اُف یہ تقاضائے حیات
زندگی وقفِ غمِ خاک نشیناں کردے

خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیِ دوراں کردے

سنہ ۱۹۵۰ء

غزل

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دُنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دُنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکر بیش و کم نہیں ہے

اُدھر مشکوک ہے میری صداقت
اِدھر بھی بدگمانی کم نہیں ہے

مری بربادیوں کا ہمنشینو!
تمھیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ابھی بزمِ طرب سے کیا اُٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے

بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجازؔ اک بادہ کش تو ہے یقیناً
جو ہم سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے

۱۹۵۰ء

غزل

جگر اور دل کو بچانا بھی ہے
نظر آپ ہی سی ملانا بھی ہے

محبت کا ہر بھید پانا بھی ہے
مگر اپنا دامن بچانا بھی ہے

جو دل تیرے غم کا نشانہ بھی ہی
قتیلِ جفائے زمانہ بھی ہے

یہ بجلی چمکتی ہی کیوں دم بدم
چمن میں کوئی آشیانہ بھی ہے

خرد کی اطاعت ضروری سہی
یہی تو جنوں کا زمانہ بھی ہے

نہ دُنیا، نہ عقبیٰ کہاں جائیے
کہیں اہلِ دل کا ٹھکانا بھی ہے

مجھے آج ساحل پہ رونے بھی دو
کہ طُوفاں میں مسکرانا بھی ہے

زمانے سی آگے تو بڑھئے مجاز
زمانے کو آگے بڑھانا بھی ہی

سنہ ۱۹۵۰ء

سانحہ

(گاندھی جی کی موت سے متاثر ہو کر)

دردو غمِ حیات کا درماں چلا گیا
وہ خضرِ عصر و عیسیِ دوراں چلا گیا

ہندو چلا گیا، نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

رقصاں چلا گیا، نہ غزلخواں چلا گیا
سوز و گداز و درد میں غلطاں چلا گیا

برہم ہے زلفِ کفر، تو ایماں ہے سرنگوں
وہ فخرِ کفر و نازشِ ایماں چلا گیا

بیمار زندگی کی کرے کون دل دہی
نبّاض و چارہ سازِ مریضاں چلا گیا

کس کی نظر پڑیگی اب "عصیاں" پہ لطف کی
وہ محرمِ نزاکتِ عصیاں چلا گیا

وہ رازدارِ محفلِ یاراں نہیں رہا
وہ غم گسارِ بزمِ حریفاں چلا گیا

اب کافری میں رسم و راہِ دلبری نہیں
ایماں کی بات یہ ہی کہ ایماں چلا گیا

اک بیخودِ سرورِ دل و جاں نہیں رہا
اک عاشقِ صداقتِ پنہاں چلا گیا

باچشمِ نم ہی آج زلیخائے کائنات
زنداں شکن وہ یوسفِ زنداں چلا گیا

اے آرزو وہ چشمۂ حیواں نہ کر تلاش
ظلمات سی وہ چشمۂ حیواں چلا گیا

اب سنگ و خشت و خاک و حدف سربلند ہیں
تاجِ وطن کا لعلِ درخشاں چلا گیا

اب اہرمن کے ہاتھ میں ہے تیغ خونچکاں
خوش ہے کہ دست و بازوئے یزداں چلا گیا

دیو بدی سے معرکہ سخت ہی سہی
یہ تو نہیں کہ زورِ جواناں چلا گیا

کیا اہلِ دل میں جذبۂ غیرت نہیں رہا
کیا عزمِ سرفروشیِ مرداں چلا گیا

کیا باغیوں کی آتشِ دل سرد ہو گئی
کیا سرکشوں کا جذبۂ پنہاں چلا گیا

کیا وہ جنونِ و جذبۂ بیدار مر گیا
کیا وہ شبابِ حشر بداماں چلا گیا

خوش ہے بدی جو دام یہ نیکی پہ ڈال کے
رکھ دینگے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

سنہ ۱۹۵۰ء

خراجِ عقیدت

اک نیا پیغمبرِ امن و اماں پیدا ہوا

کارواں میں اک امیرِ کارواں پیدا ہوا

ایک خضرِ عصرِ حاضر، اک کلیمِ عہدِ نَو

ایک صدرِ محفلِ روحانیاں پیدا ہوا

اک حُدی خوانِ محبت، اک نقیبِ اتحاد

اک فدائے سوزِ ناقوس و اذاں پیدا ہوا

حق کا سودائی حقیقت کا علم کھولے ہوئے

صدق کا شیدا، صفا کا پاسباں پیدا ہوا

سر بسر اک مژدۂ تسکینِ مردانِ ضعیف
قوتِ بازوئے یاراں جواں پیدا ہوا

اس چمن کی سرزمیں ہر روکشِ ہفت آسماں
اس چمن میں طائرِ عرش آشیاں پیدا ہوا

اک گُلِ تازہ جو مرجھا کر بھی مرجھایا نہیں
صفحۂ ہستی پہ نقشِ جاوداں پیدا ہوا

خوں سے اسکے آج بھی گلرنگ ہے خاکِ وطن
فخرِ عالم، نازشِ ہندوستاں پیدا ہوا

سنہ ۱۹۵۱ء

غزل

دامنِ دل پہ نہیں بارشِ الہام ابھی
عشق ناپختہ ابھی، جذبِ دروں خام ابھی

خود جھجکتا ہوں کہ دعوائے جنوں کیا کیجیے
کچھ گوارا بھی ہے یہ قیدِ در و بام ابھی

یہ جوانی تو ابھی مائلِ پیکار نہیں
یہ جوانی تو ہے رسوائے مئے و جام ابھی

واعظ و شیخ نے سر جوڑ کے بدنام کیا
ورنہ بدنام نہ ہوتی مئے گلفام ابھی

میں بصد فخر یہ زہاد سے کہتا ہوں مجازؔ
مجھکو حاصل، شرفِ بیعتِ خیّامؔ ابھی

۱۹۵۱ء

غزل

عاشقی جانفزا بھی ہوتی ہے
اور صبر آزما بھی ہوتی ہے

روح ہوتی ہے کیف پرور بھی
اور درد آشنا بھی ہوتی ہے

حسن کو کر نہ دے یہ شرمندہ
عشق سے یہ خطا بھی ہوتی ہے

بن گئی رسم بادہ خواری بھی
یہ نماز اب قضا بھی ہوتی ہے

جس کو کہتے ہیں نالۂ برہم
ساز میں وہ صدا بھی ہوتی ہے

کیا بنا دو مجازؔ کی دنیا
کچھ حقیقت نما بھی ہوتی ہے

سنہ ۱۹۵۲ء

زہرابِ حُسن

حُسن اک کیف جاودانی ہے — اور جو چیز ہے وہ فانی ہے
حُسن کے دن بھی کیف پرور ہیں — حُسن کی رات بھی سہانی ہے
حُسن کی صبح اک شکستِ جمیل — حُسن کی شام کامرانی ہے
یہ کچھ افسانۂ تخیّل ہے — کچھ حقیقت کی ترجمانی ہے

کچھ ترے حسن کا کرشمہ ہے
کچھ مری طبع کی روانی ہے

۱۹۵۲ء

غزل

رات اک حشر سا برپا کیا تھا
پرتوِ ساغرِ صہبا کیا تھا

میں نے اک خواب سا دیکھا تھا
کیوں جوانی کی مجھے یاد آئی

عشق کو آپ نے سمجھا کیا تھا
حسن کی آنکھ بھی نمناک ہوئی

حسن اور حسن کا پردا کیا تھا
عشق نے آنکھ جھکا لی ورنہ

کیوں مجازؔ آپ نے ساغر توڑا
آج یہ شہر میں چرچا کیا تھا

۱۹۵۲ء

غزل

یہ جہاں بارگاہِ رطلِ گراں ہے ساقی
اور ایک جہنم مرے سینے میں تپاں ہی ساقی

جس نے برباد کیا مائلِ فریاد کیا
وہ محبت ابھی اس دلمیں جواں ہی ساقی

ایکدن آدم و حوّا بھی کئے تھے پیدا
وہ اخوّت تری محفل میں کہاں ہی ساقی

ہر چمن دامنِ گل رنگ ہی خونِ دل سی
ہر طرف شیون و فریاد و فغاں ہی ساقی

ماہ و انجم مری اشکوں سی گہر تاب ہوئے
کہکشاں نور کی ایک جوئے رواں ہی ساقی

حسن ہی حسن ہے جس سمت بھی اٹھتی ہی نظر
کتنا پر کیف یہ منظر، یہ سماں ہی ساقی

زمزمہ! ساز کا، پائل کی چھناکے کیطرح
بہتر از شورشِ ناقوس و اذاں ہی ساقی

میرے ہر لفظ میں بیتاب ہے مرا سوزِ دروں
میری ہر سانس محبّت کا دھواں ہی ساقی

نقوش

(۱)

حجابِ ناز میں جلوے چھپائے جاتے ہیں
جہاں میں اہلِ نظر آزمائے جاتے ہیں

ابھی بہار بہت دُور ہی مگر دل میں
جنونِ عشق کے آثار پائے جاتے ہیں

مٹا دیا ہی مجھے عشق نے مجازؔ مگر
سنانیوالے ابھی تک سنائے جاتے ہیں

(۲)

کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا
آپ نے خود بھی تو دامن نہ بچانا چاہا

یوں تو افسانۂ الفت تھا ازل سے رنگیں
ہمنے کچھ اور بھی رنگین بنانا چاہا

(۳)

وعدہ ترا گو وعدۂ باطل تو نہیں ہی
یہ باعثِ تسکینِ غمِ دل تو نہیں ہی

کیوں خوش ہی کوئی خستہ و واماندۂ طوفاں
یہ موجِ بلا ہی کوئی ساحل تو نہیں ہی

(۴)

مے گلفام بھی ہی، سازِ عشرت بھی ہی، ساقی بھی،
مگر مشکل ہی آشوبِ حقیقت سے گذر جانا

(۵)

پہلے وہ جورِ پریشاں تھے
اور اب لطفِ پریشاں ہیں

(۶)

جگر کی خبر ہے نہ دل کی خبر
مگر لڑ رہی ہو نظر سے نظر
یہ سب جن کے ہیں خون سے ہاتھ تر
یہی تھے مسیحا، یہی چارہ گر

(۷)

میں کہ بربادِ نگارانِ دل آرا ہی سہی
میں کہ رسوائے مے و ساغر و مینا ہی سہی
میں کہ مقتولِ گل و نرگسِ شہلا ہی سہی
پھر بھی خاکِ رہِ صاحب نظراں ہوں اے دوست

(۸)

اک ہبک اور حسیں کار ابھی گذری ہے
گنگناتی ہوئی سرشار ابھی گذری ہے
سُن رہا ہوں دلِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا
خالقِ حسن کی شہکار ابھی گذری ہے

(۹)

مجھے ساغر دوبارا مل گیا ہے
تلاطم میں کنارا مل گیا ہے
مری بادہ پرستی پر نہ جاؤ
جوانی کو سہارا مل گیا ہے

(۱۰)

عشق کا ذوقِ نظارہ مفت میں بدنام ہے
حسن خود بیتاب ہے جلوے دکھانے کیلئے

(۱۱)

مجرمِ سرتابیٔ حسنِ جواں ہو جائیے
گلفشانی تا کجا شعلہ فشاں ہو جائیے
کھائیے گا اک نگاہِ لطف کا کب تک فریب
کوئی افسانہ بنا کر بدگماں ہو جائیے

(۱۲)

یہ کل شب کون میری شوخ گفتاری پہ برہم تھا
سرورِ بادہ گلرنگ تھا بے شک مگر کم تھا
نوائے شوق تھی اور پاسدارِ رسم و آئیں تھی
سرودِ سوزِ مستی تھا مگر شائستہ غم تھا

(۱۳)

اے شاعرِ آشفتہ و مستِ مئے سرجوش
کیا کہہ گیا شعروں میں تجھے یہ بھی نہیں ہوش
اک پیکرِ الطاف و عنایت پہ یہ طعنے
احسان فراموش، ارے احسان فراموش!

(۱۴)

میری عزت گئی نہ آن گئی — عید سوزِ نہاں کو مان گئی
چارہ سازیٔ انبساط نہ پوچھ — اک غم آشنا کی جان گئی

(۱۵)

یہ مانا آج دل فرطِ الم سے پارا پارا ہے
بلندی دیکھنے والے کو پستی بھی گوارا ہے
ہزاروں کے لئے میں گر چکا ہوں بامِ گردوں سے
ہزاروں وہ ہیں جن کو میں نے گردوں سے اتارا ہے

(۱۶)

دل کو محوِ غمِ دلدار کئے بیٹھے ہیں — رند بنتے ہیں مگر زہر پئے بیٹھے ہیں
چاہتے ہیں کہ ہر اک ذرہ شگوفہ بن جائے! — اور خود دل ہی میں اک خار لئے بیٹھے ہیں

(۱۷)

وقت کی سعیٔ مسلسل کارگر ہوتی گئی
زندگی لحظہ بہ لحظہ مختصر ہوتی گئی
سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا سازِ حیات
موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

(۱۸)

جوانی کی نگاہیں دیکھتی ہیں عین مستی میں
اجل کا وحشیانہ رقص، عرصہ گاہ ہستی میں
ضعیفی محفلِ عشرت سے خرقہ پوش آتی ہے
جوانی جب بھی آتی ہے کفن بر دوش آتی ہے

(۱۹)

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دُور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

(۲۰)

زہد سے اجتناب زور پہ ہے
ذکرِ جام و شراب زور پہ ہے
کیا نہ ہوگا مجازؔ اب یوں بھی
ابھی میرا شباب زور پہ ہے

(۲۱)

کُفر کیا، تثلیث کیا، الحاد کیا، اسلام کیا
تُو بہر صورت کسی زنجیر میں جکڑا ہوا
توڑ سکتا ہو تو پہلے توڑ دے سب قید و بند
بیڑیوں کے ساز پر نغماتِ آزادی نہ گا

۲۱۶

(۲۲)

یہ کوٹ بھی سفید، یہ پتلون بھی سفید
تیرے سفید ہیٹ کا ہے اُون بھی سفید
خود جسم بھی سفید ہے اور اس کے ساتھ ساتھ
میں تو یہ جانتا ہوں ترا خون بھی سفید

(۲۳)

اپنا غم اوروں کو دے اوروں کا غم لینے سے کیا
تیری کشتی پار لگ جائے گی اس کھینے سے کیا
بات تو جب ہے کہ مر جا عرصہ گاہِ رزم میں
اِس پہ دم دینے سے کیا اور اُس پہ دم دینے سے کیا

(۲۴)

خرمنِ دل جلا رہا ہوں میں
نقشِ ہستی مٹا رہا ہوں میں
تُو نہ مغموم ہو مگر اے دوست
تیری ہی سمت آ رہا ہوں میں